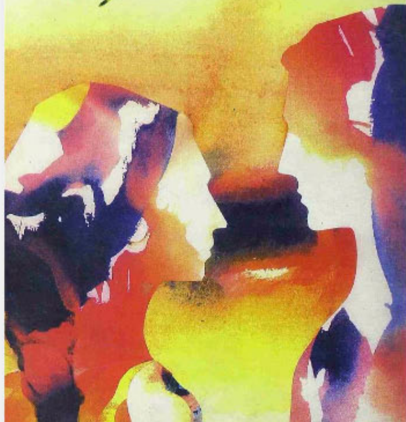
امرتا پریتم

49 دن



اُنچاس دِن

49-دِن

اَمرتاپریتم

"تخلیق زندگی کا بہترین روپ ہے۔"
[ژاں پال سارتر]

GITA SINGH, 6528-N, 63rd PLACE,
PARADISE VALLEY. ARIZONA, 85253 U.S.A

نام کتاب	:	49-دن
مصنف	:	امرتا پریتم
اسکرپٹ	:	گورمکھی (پنجابی)
مرتب	:	بلراج ورما
		24ڈی، پاکٹ 3، میور وہار، فیز1، دہلی-110091
کمپیوٹر کمپوزنگ	:	محمد اسلام خان(9910100445)
سرورق	:	امروز
اشاعت	:	2006
تعداد	:	پانچ سو(500)
قیمت	:	-/90(نوے روپے)
زیر اہتمام	:	ملکی ورما، منتظم: تناظر پبلی کیشنز، دہلی-91
طباعت	:	بھارت آفسیٹ، لال کنواں، دہلی-6

[یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔]

UNCHAS DIN (Panjabi Novel)

by

AMRITA PRITAM

پیش کردہ
اندر کمار گجرال
سابق وزیر اعظم (ہند)
7/8/06

49 DAYS (URDU)

Tanazur

24-D, Pocket-3, Mayur Vihar Phase-1,
Delhi- 110 091 Phone : 011 - 22718482

اِنتساب

سرحدوں کی تفریق سے آزاد۔ ہندو پاک کے
سیکولر سماج کے نام

—— بلراج ورما

ترتیب

اِس ناول کو اُردو میں منتقل کرنے کی تحریک مندرجہ ذیل الفاظ سے ملی ہے:

''سیکولرزم کے بغیر ہندوستان ایک دن بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ اُردو نے سیکولرزم کو فروغ دینے اور اسے زندہ رکھنے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ وہ واحد زبان ہے جو بغیر کسی ترجمان کی مدد کے دلوں میں سیدھے اتر جاتی ہے۔ درحقیقت یہ ہندوستانی زبانوں کا تاج محل ہے۔ جس پر ہم تمام ہندوستانیوں کو فخر ہونا چاہیے۔''

پیش لفظ

امرتا جی ترقی پسند تحریک کی اُن روشن ترین شخصیات میں سے ہیں جن پر ہم بجا طور پر ناز کر سکتے ہیں۔

امرتا ہمارے دور کی سچی نقاش ہے۔ اس نے اس بدنصیب صدی کی تہذیبی اور سیاسی فضاؤں، بہاروں اور خزاؤں یعنی اس کے سارے سکھوں، دُکھوں کو جیا اور اپنی ذات پر جھیلا ہے اور اس کی راکھ کو سندور مان کر اپنی مانگ کو سجایا سنوارا ہے۔ ہمارے دوزخی سماج کی آگ میں تپ کر بھی یہ پُر بہار پُر شباب اور پُر وقار عورت جھلسی یا کمھلائی نہیں بلکہ کندن کی مانند پاک و شفاف ہو کر ہمارے سامنے آئی ہے۔

ہمارے گلشن حسن و عشق کی نکہتِ ابدی

اس پُر بہار شاعرہ نے ہماری زندگیوں کو سجایا سنوارا اور نکھارا ہے —— ہماری سنگلاخ راہوں کو ہموار کیا ہے اور ہمیں زندگی جینے کا درس اور سلیقہ دیا ہے، محبت دی ہے۔

امرتا پریتم جی کا پنجابی ناول ''49 دن'' دو معصوم سی آتماؤں کی چرچا ہے جو اس عظیم فنکارہ کے الفاظ کی شاعرانہ قبا اُوڑھ کر ایک سہانا پریم گیت بن گئی ہے۔

بلراج ورما

ایک مسافت

میں سب سے زیادہ ہندوستان کی قدیم تاریخ اور ارسطو کی زیر بار ہوں۔ جس نے جگہ جگہ میرے ذہن کی راہ داریوں اور روکاروں پڑی سوچوں کی تصدیق کی ہے۔

بھارتیہ ارسطور میں فطرت کی طاقتوں کو جو شکل دی گئی ہے، صرف ظاہری شکل ہی نہیں بلکہ اوصاف اور قدر و قیمت کے حساب سے انھیں جن علامتوں کے طور پر برتا گیا ہے، وہ ایک بہت ضخیم دستاویز پر مشتمل ہے۔ یہ دستاویز بیان کرتی ہے کہ انسان کی قوتِ متخیلہ کس طرح آسمانوں پر کمند ڈالتی ہے... اور اس قوتِ متخیلہ کو حقیقت کی سرحدوں کا پابند بنانا بھی ممکن ہے۔

اصل میں ہر تخلیق کار کو ـــــ ہر فلسفی کو یہی مسافت طے کرنی ہوتی ہے اسی مسافت کو میں حقیقت سے حقیقت تک کے سفر سے موسوم کرتی ہوں۔ ایک تو وہ حقیقت جو موجود ہے اور ایک وہ حقیقت جو امکان میں ہے۔

جو گمان میں ہے، اس کے امکان کا سب سے بڑا ثبوت اس وقت ملا ـــــ جب میں نے اگستیہ رشی کے بارے میں پڑھا کہ اس نے کائنات کی جملہ مخلوقات کے جمال کا جوہر کشید کر کے ایک نسوانی پیکر مرتب کیا۔ اور اس بچی کو وِدربھ کے حکمراں کے سپرد کر دیا۔ جب وہ بچی شباب کو پہنچی تو اگست رشی نے اس سے عقد باندھ لیا ـــــ اس کا نام لوپادلا تھا۔ یہی لوپادلا تاریخ کی حقیقت ہے۔ کیونکہ ایک اعتبار سے اس کی کہانی رگ وید میں درج ہے...

رگ وید میں فطرت کے قویٰ کی حمد و ثنا میں ستائیس فضیلت مآب خواتین کی تخلیقات درج ہیں۔ ان سے سوریہ ساوتری کی ذہنی اپج نے مجھے غایت درجہ حیران کیا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ جب افق کی سرخی سورج سے ہم آغوش ہو تو اس کی آنکھوں میں حکمت کا سرمہ ہونا چاہیے۔ یعنی ایک مرد اور عورت اس طرح بہم ہوں کہ وید کے منتر ان کا جہیز ہوں اور دنیا بھر کے اربابِ دانش ان کی تقریبِ عروسی کے پروہت ہوں اور آزادی کے سہاگ کا بستر ہوں ـــــ اور ان کا وصل...

یہ رویا جیسی سوچ میرے ذہن میں تھی اور ایک بے بسی کی کیفیت میں میں نے نظم کہی تھی۔ اوّلین دین:

میں نے جب تم کو زیب تن کیا
تو دونوں پیکر باطن عبادت میں مگن تھے
اعضاء پھولوں کی طرح گندھے
اور روح کی درگاہ پر نذر ہو گئے
تم اور خوشبو کے لوازمات
ایک دوسرے کا نام ہونٹوں پر آیا
اور وہی نام عبادت کا کلمہ تھا
یہ میرے اور تمہارے ہونے کا وظیفہ تھا

دینی اعمال کی داستان تو بہت بعد کی بات ہے۔ دنیا کے کسی معاشرے کا کوئی ضابطہ ـــــ میرے اس خیال سے متفق نہیں تھا۔ تب عجیب و غریب سانحہ سرزد ہوا کہ اس نظم کی اشاعت کے کچھ دیر بعد میں نے رگ وید کی وہ سطریں پڑھیں جنھیں سوریہ ساوتری نے سپردِ قلم کیا تھا۔ تو مجھے یوں لگا کہ عہدِ عیسوی کے آغاز سے بھی کوئی تین یا چار ہزار سال پہلے جو حقیقت سوریہ ساوتری پر منکشف ہوئی تھی... وہی میری ذہنی حدود تک آ پہنچی ہے... اور اس نے شہادت دی کہ حقیقت سے حقیقت تک کی مسافت طے کی جا سکتی ہے۔

امرتا پریتم

راکا سنہا: انٹرویو

''میں محبت کے باب میں بھی خامہ فرسائی کرتی ہوں لیکن محدود معنوں میں نہیں۔ آپ کا پہلا رشتہ اپنی ذات سے ہے، پھر اس فرد سے جو آپ کا ممدوح ہے۔ محبوب ہے، پھر معاشرے سے، مختلف عقائد سے، ذاتوں اور رنگوں سے —— محبت حاکم اور محکوموں کے درمیان، اور محبت ملکوں کے مابین۔''

امروز

''میں صرف اپنے لیے تصویر بناتا ہوں۔'' وہ کہتا ہے۔ چنانچہ، جب امرتا اپنے ملاقاتیوں سے مکالمہ کرتی ہے تو وہ چائے پیش کرتا ہے۔ جب وہ تلاشِ حیات میں ادبی سرحدیں عبور کر رہی ہوتی ہے تو وہ پس منظر پر اکتفا کرتا ہے۔ اس کی عظمت اور ذہنی پراگندگی کا خاموش ہم سفر بنتا ہے۔ جو ہوسکتا ہے، کسی نہ کسی طرح یہ اس کی تلاش بھی ہو۔''

''میں نے ساحر پر اپنے خوابوں کی سرمایہ کاری کی، اپنے احساسات اور خیالات کے لیے آشیانہ تلاش کرنے کی کوشش کی۔ میرا ذہن ہمیشہ اپنے سے رفیع تر کی تلاش میں رہتا تھا۔ جو میری تلاش کو زبان دینے میں میرا ساتھ دے اُسے میں نے امروز میں پایا۔ ایک محبت آسمان جیسی ہوتی ہے اور دوسری اس طرح جیسے سر پر چھت۔ ساحر آسمان کی طرح تھا۔ امروز —— میری پناہ گاہ بنا، میرے سر پر ایک چھت۔''

''میں تنہائی محسوس نہیں کرتی۔ میں اکیلی ہوں۔ اگر آپ تنہائی محسوس کریں تو احساسِ شکست سے دوچار ہونے لگتے ہیں۔ اگر آپ اکیلے ہوں تو پھر احساسِ شکست طاری نہیں ہوتا۔ میں صرف سوچتی ہوں۔ اور جب میرے ذہن کے شیشے میں کوئی عکس واضح ہو تو اسے لکھ دیتی ہوں۔''

''اپنی نظموں اور نثر کے توسل سے وہ زندگی کے تنزل کا سبب تلاش کرتی

ہے —— سیاست داں کو اقتدار کی ہوس ہے، مذہب کی تہی سامانی جو انسانوں کو نفرت اور دوسروں کو قتل کی تلقین کرتی ہے۔ اپنے تازہ ترین ناول —— ''49 دن'' میں مرکزی کردار ایک ہندو کا ہے جس سے ایک مسلمان لڑکی محبت کرتی ہے۔ جب وہ شادی کا فیصلہ کرتے ہیں تو لڑکی کا باپ کہتا ہے: ''تم اسے ہندو بنالو۔'' آدمی کہتا ہے۔ ''ہم تبدیلی مذہب میں یقین نہیں رکھتے۔ نہ وہ نہ میں۔''

''ادیب'' میں کہتی ہوں۔ ''خوف ناک حد تک اظہار کی خواہش میں مبتلا ہوتے ہیں۔''

''ہاں''، وہ کہتی ہے۔ ''یہ ایک تخلیقی خواہش ہے اور اگر تحریر کے ذریعے لوگوں کے رویوں اور نقطہ ہائے نظر کو بدلا جاسکے تو ایک بہتر معاشرت کی طرف پیش رفت ہوسکتی ہے۔''

''آپ اپنی تحریروں سے معاشرے کو بدلنا چاہتی ہیں؟ میں اس سے پوچھتی ہوں۔ نہیں، یہ بلاواسطہ نہیں ایک بالواسطہ تبدیلی ہوسکتی ہے۔ اطراف میں کثافت ہی کثافت ہے۔ آپ اسے صاف کرنا چاہتے ہیں تو آپ لوگوں کو اس سے آگاہ کرتے ہیں۔ میں دنیا کو تبدیل نہیں کرسکتی، تبدیلی تو عوام لاتے ہیں۔

اس کے کمرے کے ایک گوشے میں رکھی الماری میں وہ یادیں ہیں جنھوں نے اس کے کئی خواب بنے ہیں۔ وہاں ٹالسٹائی کی قبر سے لایا گیا ایک پتہ ہے اور ایک کاغذ کا ٹکڑا، جس کے ایک طرف لکھا ہے ''ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس'' اور دوسرے پر ساحر لدھیانوی، شراب کی صراحیاں، خوشبوئیں، نکلس دوسرے ملکوں کے ادیبوں کے بھیجے ہوئے تحائف اور امروز کے خطوط کچھ ساحر کے مکتوبات اور کچھ اس کے بچوں کی چٹھیاں —— بہت سی کتابیں اس کے کمرے کی دیواروں سے لگی ہیں۔ بہت سی ہندوستانی ادیبوں کی ہیں۔ اور کچھ نکوس کا زلزلہ، زاکیس، آئین رینڈ اور نفسیات داں لینگ کی۔

اس کے دنوں کے لمحے مسلسل ان کتابوں سے علم اخذ کرتے رہتے ہیں یا کاغذ پر خیالات کا تجزیہ کرتے رہتے ہیں۔ وہ نہ تو زیادہ تر باہر جاتی ہے اور نہ ہی وہ لوگوں کی زیادہ تواضع کرتی ہے۔ وہ رات کے وقت لکھتی ہے، رات کے آخری حصے میں صبح کے تین بجے بیدار ہوتی ہے اور دوپہر کے بعد سوتی ہے۔ امروز اور وہ مل کر کھانا تیار کرتے ہیں۔ ایک سالن صبح کے لیے ایک شام کے لیے، ان کے پاس ملازم نہیں۔ وہ اس کی بیٹی اور امروز باری باری باورچی خانے کی ذمہ داری

سنبھالتے ہیں۔

صوفی شاعروں کواس لیے قتل کیا گیا کہ انھوں نے مذہب میں انقلاب کی تبلیغ کی۔ ''خدا کو پہچانو، انھوں نے کہا۔ معبدوں میں نہیں۔ اپنے اندر۔'' امرتا بھی ہر روز خود کو تھوڑا تھوڑا قتل کر کے شعروں میں منتقل کرتی رہتی ہے، حق گوئی اور بیباکی کے ساتھ۔ لیکن وہ زندہ رہتی ہے اور ازسرِنو زندگی اختیار کرتی ہے تا کہ وہ اپنے عہد کے آشوب کا زائچہ مرتب کر سکے۔ انسان کے مقدر کا نوشتہ۔



کندلا (عبرت نامہ)

ابھی میرے بچے قریب قریب اسی عمر کے ہیں، جب وہ نہیں جانتے کہ ناول کیا ہوتا ہے، یا گیان پیٹھ ایوارڈ مصنفین کو ملتا ہے۔ لیکن جب ان کے اسکول کی کوئی استانی اخبار میں چھپی ہوئی تصویر انھیں دکھا کر کہتی ہے' کارتک' مٹھائی کھلاؤ، آپ کی نانی ماں کو اتنا بڑا ایوارڈ ملا ہے یا اور مدرسین کہتے ہیں'' آروہی! آج میں نے تمہاری نانی ماں کا ناول پڑھا تھا۔'' تو دونوں بچے اسکول میں فخر سے تن جاتے ہیں اور میں سوچتی ہوں کہ شاید یہ بچے میرے فیصلے نہیں کریں گے۔ یہ شاید بڑے ہو کر فن کار بھی بنیں اور زندگی میں محبت بھی کریں گے۔

یہ بچے میری طرح ریاضت کے دکھ نہیں جانتے۔

چندنجی ملاقاتیں: احمد سلیم (پاکستان)

امرتا جی کو اپنی طرف کے پنجابی ادیبوں سے شکایت ہے کہ وہ کیچڑ اچھالنے کا کاروبار بہت کرتے ہیں۔ ہماری طرف بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ امرتا جی کے خط میں سجاد حیدر کا ذکر پڑھ کر مجھے ایک پنجابی ادیب کے دشنام نما الفاظ یاد آ گئے۔ اس نے اپنے پیلے دانت نوچتے ہوئے کہا تھا:

''امرتا پریتم، سجاد حیدر پر ریجھ گئی تھی لیکن اپنا یار بڑا بزدل نکلا۔ بہت زور کا عشق چلا تھا ان کا تقسیم سے پہلے۔ تمھیں ایک راز کی بات بتاؤں، اس کی نظم ''سینٹرے'' سجاد حیدر کے نام ہی تو ہے...''

یہ فقرے یاد کر کے مجھے بڑی کراہت محسوس ہوئی۔ لگا ابھی متلی ہو جائے گی۔ مجھے چکر آنے لگے۔ میرے سامنے سجاد حیدر کا معصوم، بھلا مانس اور دوست چہرا ابھرا اور میری آنکھوں میں گڈمڈ ہونے لگا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا اور کرسی میں ڈھ گیا۔ کئی سال بعد امرتا پریتم جی نے سجاد حیدر کے ساتھ اپنی دوستی کے بارے میں رسیدی ٹکٹ اور میں جمعے تو، میں بڑے احترام کا اظہار کیا تھا لیکن افسوس کہ رسیدی ٹکٹ کے پاکستانی اردو ایڈیشن میں سجاد حیدر کے بارے میں وہ تمام سنسر کر دیا گیا تھا۔ جب امرتا جی نے اس غیر اخلاقی پریتم کی کتابوں پر احتجاج کیا تو پبلشر ادھر اُدھر ان کے خلاف بے پر کی ہانکنے لگا۔ پاکستان میں امرتا پریتم کی کتابوں کی چوری بھی ایک علاوہ موضوع ہے۔ یہاں یہی کہنا کافی ہے کہ کچھ لوگ پیسہ کمانے کے لالچ میں اس قدر اندھے ہو جاتے ہیں کہ انھیں پاکستان کی عزت اور وقار کا خیال بھی نہیں رہتا۔

لندن میں امرتا جی نے فہمیدہ کو میرے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا۔ فہمیدہ ان کی اپنی آواز میں ایک کیسٹ بھر کر لائی تھی اور مجھے خطوں کے ذریعے لالچ دیتی کہ اگر میں کراچی آؤں تو وہ مجھے یہ کیسٹ سنوائے گی اور میں سچ مچ کراچی چلا گیا تا کہ امرتا دیدی کی آواز سن سکوں۔ وہ کہہ رہی تھیں:

''رات اُنگھلاندی پئی
کسے نے انسان دی چھاتی توں سنھ لائی ہے
ہر چوری توں بھیانک ایہہ سپیاں دی چوری ہے
چوراں دے کھرے
ہر دیس دے، ہر شہری دی، ہر سڑک تے بیٹھے
پر کوئی اکھ نہیں تکدی، نہ چونکدی
صرف اک کتے دی طرحاں اک سنگلی دے نال بجھی
کسے ویلے، کسے دی، کوئی نظم بھونکدی''

تے اک ہور نظم سی——

''اک درد سی

جو سگریٹ دی طراں میں چپ چاپ پیتا

صرف کچھ نظماں ہین

جو سگریٹ دے نالوں میں راکھ وانگوں جھاڑیاں

نظمیں سنتے ہوئے میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے، میں ٹیپ ریکارڈر کے قریب اپنا چہرہ لے جا کر زور سے چیخا ''دیدی! میں آپ کو سن رہا ہوں، کیا آپ بھی میری آواز سن رہی ہیں۔''

''سارا کے لیے بہت فکر بہت مند ہوں۔'' سارا کو بھی انھوں نے دو خط لکھے تھے۔''میں کسی کے خط کا انتظار نہیں کرتی۔ صرف تمہارے خط کی منتظر رہتی ہوں۔ میری جان! تم بیمار نہیں ہو، تم میرے پاس ہندوستان چلی آؤ، اگر کوئی تکلیف ہے تو اس کا علاج کراؤں گی۔ تمھیں اپنے پاس رکھوں گی۔ جتنی دیر تم چاہو گی... تمہاری نظموں نے مجھے موہ لیا ہے۔ تمہاری جیسی زبان داں کبھی صدیوں میں جنم لیتی ہے۔ وقت اگر تمھیں شناخت نہیں کر سکا تو یہ وقت کا قصور ہے، تمہارا نہیں...''

++

از بیک شاعر

خرمازار

اُمــرتا
خوب صورت پنجابی ملکہ

ہمارے لوگ خوشی سے کھلے

اور ہندوستان سے آئی عزیز کو

آج خوش آمدید کہتے

او خوب صورت پنجابی ملکہ!

اوپُر جوش دل والی بانو!

میری دُعا ہے

کہ مستقبل میں تم پہلے سے زیادہ گیت گاؤ

از بیک شاعر
شکر ادا

بہار جیسی ہندوستانی عورت

زیفہ ادا امرتا کی دیرینہ دوستی
از بیک شاعرہ کے پرسکون اور آراستہ گھر میں
شاہی پردوں کی اوٹ سے
صبح کی ہوا جھانک رہی ہے
اطلس کے لحاف میں سے اٹھ کر
امرتا نے آنکھیں کھولیں
بہار جیسی ہندوستانی خاتون!
سامنے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے
گئی رات کے مشاعرے کو اور دوستانہ گفتگو کو
شاید تمہاری یادداشت اب تک دُہرا رہی ہو
تم دونوں یک جاں
آج سبز گھاس پر یوں چہل قدمی کر رہی ہو
جیسے ایک مدت کی شناسائی ہو / ابابیلیں محو پرواز ہیں
یہیں سے سخن طرازی آغاز ہوتی ہے
اور بات آگے بڑھتی ہے —— عہد کے مقدر کی
پھولوں اور رنگوں کی / تم دونوں —— بے پری پرواز کر رہی ہو
انسان دوستی کے پر، دل سے جوڑ کر / زندگی کو دوستی کا جھونٹا دیتی ہو

++

از بیک شاعر
خیر الدین سالوہ

اطلیس بنارسی صبح

امرتا! تم نے آج ہمیں نظموں میں پرو لیا ہے
انسانی احساس کو، عقل اور علم کو
تیرا معیار —— بھارت کا تکلف

امرتا! تم پنجابی ملہار کی ملائم آواز
تم بنگال کی گہری خلیج سی
تم اطلیس بنارسی صبح ہو
تمہارے اہلِ وطن ——
خوب صورت کناروں کے مابین بے چینی سے بہتی
گنگا کی تال پر بھنگڑا ڈالتے

ایک بے پناہ غربت ہے
لیکن تم —— کھجوروں کے باغات کی مہک میں بھیگی
نرم نرم ہلکورے لیتی ہو
میں جن نظموں پر نچھاور ہو گیا ہوں
وہ نظمیں تم ہمیشہ گاتی رہنا

++

سوئٹزرلینڈ
دیو

ایک مکتوب نُما
اَمر تا اور اِمروز کے لیے

تیرا چہرہ
برکات اور تخلیق کے مابین
ساز کی آیت
جگمگاتی صدائے بازگشت
جس کے مشاہدے کا انداز ہم بھول گئے ہیں
تم نے اپنی مٹی پر سہے ہیں
ہر طرح کے بادِ گرد

سازشیں
ناٹک اور نقاب
جو مضحکہ خیز ہنسی ہنستے ہیں
چاقو، دہلیزیں، کفر، پہیلیں بنے ہوئے
جب تک ہم نفرت میں تبدیل ہو چکے ہوتے ہیں
تم نے محبت کو تشدد میں
اور چنگے بھلوں کو بربریت میں ڈھلتے دیکھا ہے
رشتے جب تاش کے پتے سے بن جائیں
تو جب تک جینے کے لیے کچھ باقی نہیں بچتا
تمہاری مسکراہٹ بہت دوری پر بھٹکتے لمحوں کی یاد

تمہاری چپ، گہرے کرب کے بیاباں سے گزر کر آئی منترندی
تم اور الفاظ سب لکیروں سے عاری رقص
تم نے ہوا کو انسان کی مٹی سے علاحدہ کر کے
خوابوں سے باغ میں اس کو ایک علاحدہ شناخت دی ہے
ہوا کو چھٹی پسلی کی تہمت سے بری کیا ہے
تم، جس نے مصر سے موہن جودڑو تک
سیاہ فام صورتوں کو ہر طرح کی شکلوں میں
اُتھل پتھل ہوتے دیکھا ہے
جو بیک وقت عمل بھی ہو اور ایک عارفانہ بے نیازی بھی
تم صبحوں کا عہد نامہ ہو
گزرے وقتوں کی پرچھائیاں نہیں
تمہاری سلطنتِ ابجد میں نہ دیواریں نہ مناقشیں
خوش آمدید کی مسرت ہے
قلوب کی نہ ختم ہونے والی بات
تمہارے دروازے پر دوستی —— عبارت
علم، بدھا اسٹوپا
تمھیں روشنی کے سوا کسی دوسرے نام سے مخاطب نہیں کیا جا سکتا
میری یادداشت میں تمہارا نام
تمہارا نام دوستی کی نیلگوں نقاشی
تم سے ملنا تمہاری خوشی نہیں ہو سکتا
تم جو ہمارے لفظ میں ہو
دیا اور دریا ——

++

ازبیائی شاعر
چپاشل

حرفوں کا گالا

امرتا پریتم کے لیے!
مجھے تم نے حرفوں کا گالا تر کر کے دیا/اور میں نے اسے حلق میں نچوڑ لیا
ہر آواز دیتا حرف، مخصوص برتاؤ کا خواہش مند
چوزے کی ٹانگ کی طرح، یا اس کے پروں کی طرح
میں نے اسے چپ چپ کر دیکھا
اور ہر شیریں نوالہ منہ میں پپولا/اتنا—— کہ آخر وہ دہن میں
اک گیت بن گیا
ایک نظم—— کہ جس پر میرا نام ابھر آیا ہے
وہ نظم لمحوں کی کتر بیونت
میرے وجود کے سیاہ اور گھنے جنگل میں سرگرداں
مجھے، تم نے جو الفاظ دیے، میں نے پی لیے
اور ان خاموش گلابوں کی میں حفاظت کروں گا
یہ چپ اور تازہ...
رات نے تیوریوں پر بل ڈالے اور دن مسکرایا ہے
محبت کی دھجیاں جوڑ کر، میں تمہاری گردن سجاؤں گا
اور سوچوں کے گھر میں امیرے احترام آلودہ ہاتھوں کی تلاوت ہوگی
میں تمہارے علم کی اور سلیقے کی / گہرائی میں ڈوبنا چاہتا ہوں
اور ہم مشترکہ بانہوں میں دنیا کو جوڑ کر / زندگی کا جام پی رہے ہیں

++

انگریز شاعر
جارج گرنتھ

رمز شناس امرتا
فن، ادب اور انسانیت کی منظم تکون

امرتا!
میں صدیوں کی رہ گزر طے کرتے تمہیں دیکھتا ہوں
جیسے پھول گرمائی گھاس پر کھلے
اور سورج تمہارے سائے کو متشکل کرے
یہ تمہاری ابجد——
طلسمی تاروں کا غالیچہ بن رہی ہے
اور ہمیں پراسرار مقامات کی طرف لے جا رہی ہے
اڑتے ہوئے عقاب کی طرح
وہ قدموں تم ہم سے رخصت ہو رہی ہو
لیکن صدیوں کے آنسو تمہارے ہم سفر ہیں
وہ تمہارے بعد بھی الڈیں گے
میں جانتا ہوں کہ وہ پھر بھی برسیں گے
لیکن تم—— اب ان کے اسرار جانتی ہو
اور بہتے ہوئے پانی کا آخری مقام بھی

++

جارجیائی شاعر
اراکلی آباشیدزے

امرتا آگ کا ملبوس

امرتا! تم سرتاپا سخن کا الاؤ / آگ کا ملبوس
میں تمہاری زبان کیسے سمجھوں / میں —— جو طائروں کی بولی نہیں جانتا
میں جو فقط یہ جانتا ہوں کہ کبوتر کیسے غٹرغوں کرتا ہے
کوئل کیوں دیوانی ہوتی ہے / جب گرمیاں آتی ہیں
میں جانتا ہوں کہ ہم سب ایک طرح کی اداسی میں ڈوب جاتے ہیں
ایک ہی وظیفہ کرتے ہیں
اور طائر اور شاعر —— محبت کو گاتے ہیں / میں جو تمہاری زبان بس اسی قدر جانتا ہوں
جتنی کبوتر کی اور جس قدر ایک کوئل کی
لیکن ایک ایقان ہے کہ تم بھی محبت کی مغنیہ ہو
کیا وہ کوئی خوش بخت ہے، جس کے لیے تیرا یہ نغمہ تخلیق کی اوڑھنی اوڑھتا ہے؟
وہ کون ہے جو تیری روح کی گنگناہٹ سنتا ہے؟
وہ کون فخر مند ہے جو ایک رقصاں روح کے لائق ہے؟
تم امرتا! جو سخن کی آگ میں پگھلی ہوئی ہو اور سامنے ایک نظم بن کر جل رہی ہو
خدایا! میں چاہتا ہوں کہ یہ نظم کبھی ختم نہ ہو
مجھے خدا توفیق دے / اور تنہائی کا کوئی لمحہ نصیب کرے
ہندوستانی، ایرانی، ازبیک، ترک، کتنے ہی لوگ تمہارے قریب آئے ہیں
میں دہلی سے رخصت ہو رہا ہوں ایک خلش لیے
بس ایک درد پال لیا ہے جو میں تمہیں بتا نہیں سکتا۔

++

ہنگری کی شاعرہ
تھور فرینک

پانی کا ایک گھونٹ

امرتا! تم آس کی چمکتی بندیا ہو
تم نے آج میرے قلم کو ایک نغمہ دیا ہے
نغمہ —— جو گہرے جہنم سے دستیاب ہوا آنچ کا ایک تکملہ
اور اس آگ سے روشنی پھیل گئی ہے
جس آگ کو میں نے خدا سے چرایا ہے
اور میری اجنبی! آج مجھے ایک چشمے کی خبر دے
اور مجھے بتا کہ اس کا شفاف پانی کیسا ہوتا ہے؟
اور وہ پانی کیسے گاتا ہے / مجھے اپنی پیاس کے جام کو لبریز کرنا ہے
اس نیلے چھلاوے آسمان کے تلے / یہ ہوا دھول سے لدی ہے
اور میری پیاس دیرینہ ہے، بہت پرانی / اور میرے اجنبی! آج کسی چشمے کی خبر دے
اور مجھے بتا کہ اس کا سفاف پانی کیسا ہوتا ہے / اور سلگتے زخموں کو وہ کیسے دھوتا ہے
ہاتھ کا اشارہ کر / اور راستہ دکھا / راستہ —— جو کسی ذخیرۂ آب تک جاتا ہو
خواہ کوئی قیمت بھی ادا کرنی پڑے / یہ جیون کا موتی میں نچھاور کر سکتی ہوں
لیکن پانی... پانی... میں سیراب ہونا چاہتی ہوں
یہ میری زندگی لے لو اور پانی کا ایک گھونٹ دے دو!

++

آذربائیجان کی شاعرہ
مروارید خانم

دو نظمیں

(۱)

امرتا تم آئیں تو ہندوستان کی آواز آئی
ہیجو کا نغمہ آیا، میری سماعتوں میں سوز بھر گیا
تمہارے ہنر کے ساز پر
آج ہماری حسرتیں نغمہ سرا ہوئیں

(۲)

دل کا سورج یوں طلوع ہو، جیسے نصف النہار
گیتوں بھری آواز ـــــ جیسے گنگا میں تلاطم
جیسے ہیجو نے کوئی گیت چھیڑا ہو اور درد آ کر ہم آغوش ہو جائے
تمہارا فن جیسے اکتارہ بجتا ہے اور میری محبت نغمہ چھیڑ رہی ہے
دونوں آنکھیں جیسے سوچوں کے دو چشمے
دو ملکوں کے گیت جوڑ دے او چاند کی کرن!
عوام کے درد کی بھٹی میں تمہارے گیت پک گئے
ہماری زیفہ مشترک ہے اور دلوں کی سنگت گہری ہے
ہوا محبت چھڑک رہی ہے اور مٹی مہک رہی ہے
میری تمنا ہے کہ تمہارے دل کے ہونٹوں پر ہمیشہ تبسم چھایا رہے

++

ننجے کا پورا وجود سمٹ سکڑ کر ایک لکیر بن گیا۔ اس کے ماتھے پر کھنچی احساس کی دھیمی سی لکیر۔ ننجے کے ہونٹوں نے نہیں، جیسے اس لکیر نے جنبش کی ہو۔

''آپ کی تعریف؟''

''میرے پورے بدن پر نمک کی قاشیں کیوں بکھیر رہے ہیں آپ؟''

کمرے میں صرف ننجے کا سب سے گہرا دوست کریم قادر ہی موجود تھا، وہ اس کے سرہانے کی جانب کھڑا تھا۔ اس نے بڑی عجلت میں کہا۔

''ننجے یار! یہ نمک کی قاشیں نہیں برف کے ٹکڑے ہیں، یہاں کوئی دوسرا آدمی بھی نہیں، صرف ڈاکٹر آیا تھا لیکن اب تو وہ بھی جا چکا ہے۔ اب صرف میں ہوں، تیرا کریم...''

ننجے کی پیشانی کی سلوٹ میں ایک بار پھر لرزش ہوئی۔

''کون، کریم میاں؟ سنو بھائی میری روح اس جسم کو خیرباد کہہ چکی ہے۔ اب اسے نمک کی قاشوں کے بیچ سنبھال کر رکھنے کی کوئی تُک نہیں۔''

جس طرح برف کے ٹکڑوں میں سے پانی کے قطرے رس رہے تھے ویسے ہی کریم کی آنکھوں سے بھی آنسو ٹپکنے لگے۔ اس نے اپنی آواز کو سنبھالا اور بولا: ''کچھ نہیں ہوا ننجے، بہت شدت کا بخار تھا، اب ٹوٹ رہا ہے...''

ننجے نے اپنی پیشانی کے احساس کو اپنی آنکھوں میں اتارنا چاہا۔ نظر بھر کر منہ کی طرف دیکھنا چاہا لیکن آنکھیں متحرک نہ ہو سکیں۔ اس نے کریم کے چہرے کو اندازے میں سمیٹا اور کہا: ''کریم یار! قدیم مصریوں کی طرح میری لاش کو صدیوں تک حنوط کر کے محفوظ رکھنے کی ضرورت نہیں، یہ بدن چار عناصر سے متشکل ہوتا ہے۔ آگ، پانی، ہوا اور مٹی اور یہ چاروں عناصر واپس لوٹانے ہوتے ہیں۔ خواہ کسی طرح ہی لوٹائے جائیں۔''

کریم کا بدن ننجے کی آواز کے ارتعاش سے یوں لرزا کہ اسے خود بھی اپنے مرجانے کا

احساس ہوا۔

لیکن منجے کی آواز اب بھی اس کے کانوں میں پہنچ رہی تھی: ''اور دوست! اسے خواہ سپردِ آتش کریں یا مٹی میں دفن کر مٹی کے حوالے، پانی میں بہا کر پانی کو دے ڈالیں۔ یا اڑتے پرندوں کی غذا بننے کے لیے باہر کھلا چھوڑ دیں بات ایک ہی ہوتی ہے... علاحدہ مذاہب نے آخرت کے الگ الگ طریقے وضع کر رکھے ہیں لیکن فرق کوئی نہیں...''

آواز کہیں بھی لرزی یا بگڑی نہیں۔ کریم کو پھر سے اپنے اور منجے کے زندہ ہونے کا احساس ہونے لگا اور اس نے بڑے رقیق دل سے کہا: ''یار منجے! پورے اڑتالیس گھنٹے کے بعد تمہاری آواز سنی ہے تم کیا جانو ان اڑتالیس گھنٹوں کے دوران میرے دل پر کیا گزر گئی ہے... اب منہ سے آواز نکلی ہے تو اچھے بول بولو... یہ کیسی باتیں کرنے لگے ہو۔''

کریم کی آواز منجے کے کانوں سے ٹکرا کر شاید زمین میں جا ملی تھی، بمشکل ایک لفظ کانوں میں پڑا: ''اڑتالیس گھنٹے...''

اور یہ لفظ منجے کے ہونٹوں پر کئی بار کانپا: ''اڑتالیس گھنٹے... اڑتا... لیس... دو دن... ابھی دو ہی دن بیتے ہیں... ابھی ڈیڑھ دن باقی ہے...''

اور منجے کی آواز مدھم سی ہو کر اس کے ہونٹوں میں ڈوبنے لگی۔ کریم نے منجے کا بازو جھنجھوڑا لیکن کوئی حرکت محسوس نہ ہوئی پھر اس نے منجے کے کان کے پاس منہ لے جا کر پوچھا: ''ابھی ڈیڑھ دن باقی ہے... مگر کیسا ڈیڑھ دن؟''

منجے کی آواز پھر لرز اٹھی —— تم نہیں سمجھو گے کریم میاں!''

کریم کا دل پگھلنے لگا —— خوب سمجھتا ہوں دوست کہ بیتا کی موت تم سے سہی نہ جا سکی، تم اس کی موت کے باعث اپنے حواس ہی کھو بیٹھے ہو لیکن اب یہ ڈیڑھ دن کیسا باقی ہے؟ یہ میں سمجھ نہیں پا رہا...

منجے کا پورا بدن برف کی سل جیسا تھا لیکن اب بھی احساس کی کوئی رمق کہیں موجود تھی جو اس سل میں سے پانی کے قطرے کی طرح کبھی کبھی ٹپک پڑتی تھی۔ وہ کہنے لگا: ''روح جب وجود کو خیر باد کہتی ہے —— اسے اس عمل سے گزرتے ہوئے پورے ساڑھے تین دن لگتے ہیں۔ دو دن ہو چکے ہیں اور ڈیڑھ باقی ہیں۔''

''بیتا تو ہمیں مار ہی گئی۔ اور اب تمہاری یہ باتیں میرے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کیے دے رہی ہیں...''

کریم رو دیا اور کہنے لگا: ''اچھا منہ کھولو، میں دوا کا چمچہ دیتا ہوں۔''

نہ جانے منجے نے کریم کی بات سنی بھی تھی یا نہیں لیکن جب کریم نے شیشی میں سے دوائی چمچ میں انڈیلی اور چمچہ اس کے منہ کی طرف سرکایا تو اس کے منہ سے نکلا: ''نہیں، نہیں، مجھے کوئی پیاس نہیں... بالکل نہیں۔''

اور منجے کے مضبوطی سے بند دانت نہ کھلے۔ کریم نے دوائی کا چمچہ زبردستی منہ میں انڈیلنا چاہا لیکن پوری دوا ہونٹوں سے بہہ کر گردن تک پھیل گئی۔

''یا خدا!'' کریم نے گھبرا کر خدا کو یاد کیا اور پھر وہ منجے کو جھنجھوڑ کر کہنے لگا: ''ڈاکٹر کہہ گیا تھا کہ سنگترے کا رس اور سبزیوں کا شوربہ تھوڑا تھوڑا کر کے ضرور دیتا رہوں... یہاں میں یہ سب کیسے تیار کروں؟ اگر تم مان جاؤ تو میں تمہیں اپنے گھر لے جاؤں؟''

کریم کی آواز منجے تک نہ پہنچ سکی۔ شاید اس کی پیشانی میں سمٹا ہوا احساس کا خط اور بھی موہوم ہو گیا تھا۔

کریم نے گھبراہٹ کے عالم میں کھڑکی کی جانب نگاہ دوڑائی اور دور دروازے کے پاس کھڑے عمارت کے چوکیدار کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا، پھر سیڑھیوں کی طرف لپکا اور سیڑھیاں طے کر کے آئے چوکیدار سے کہنے لگا کہ وہ جلدی سے جا کر ایک ٹیکسی لے آئے۔

کریم نے منجے کی الماری کھول کر اس کے چند کپڑے نکالے اور کپڑے اور دوائیوں کی شیشیوں کو ایک کاغذ میں لپیٹا اور برف کے موٹے موٹے ٹکڑے بھی جمع کر کے ایک تولیے میں باندھ لیے اور پھر میز پر سے کمرے کی چابی تلاش کرنے لگا، تاکہ چلتے ہوئے کمرے کو مقفل کر سکے۔

چوکیدار ٹیکسی لے کر آ گیا تو اس نے اُس کی مدد سے منجے کو اٹھانے کے لیے ایک بازو اس کے جسم کے گرد حمائل کیا تو منجے کے احساس نے ایک بار پھر جنبش کی ''ڈیڑھ دن ہو گیا؟ ساڑھے تین دن ہو گئے؟''

کریم کے ہاتھ وہیں کپکپانے لگے۔ منجے کہہ رہا تھا: ''لیکن میں تو تپتی نہیں پھر یہ لا ما لوگ کیوں آئے ہیں اور میرے گلے میں اپنی چادر ڈال کر روح کو راستہ دکھانے کے لیے کیوں کھڑے

ہیں... ہاں میں آرہا ہوں پیچھے پیچھے آپ آگے آگے چلیے...''

یا اللہ... کریم کے منہ سے نکلا اور اس نے دانتوں سے اپنا ہونٹ کاٹ لیا۔ بچے پھر نہیں بولا تھا۔ کریم نے ایک بے بسی کے عالم میں دونوں ہاتھوں سے بچے کو اٹھا کر اپنے کندھے پر ڈال لیا اور چوکیدار سے کمرہ مقفل کروانے کے بعد سیڑھیاں اترنے لگا۔

چراغ دلّی میں جھونپڑیوں کی ایک بستی تھی جہاں کریم کا گھر تھا۔ گو یہ گھر کافی کشادہ تھا لیکن بظاہر کھنڈروں کا ایک حصہ نظر آتا تھا۔ دونوں طرف کتنی ہی چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں اور درمیان میں کافی کشادہ منڈیروں والے کنوئیں پر مشتمل ایک دالان، مگر جس گلی کے اندر سے اس گھر کو راستہ جاتا تھا وہ کچھ تنگ تو تھی ہی، یہاں کے مکینوں نے چارپائیاں اور مونڈھے بچھا کر اسے مزید تنگ بنا دیا تھا۔ کسی کسی نے تو وہاں اپنے مویشی اور جانور بھی باندھ رکھے تھے۔ اس تنگ گلی کی باس میں سے اگر کوئی شخص ایک بار سانس روک کر گزر جائے، کریم کا اس گلی میں کھلنے والا دروازہ بند بھی کر لے تو اندر جا کر ایک اکھڑی اکھڑی سانس ضرور لینی پڑتی تھی —— لیکن بہت کشادگی کے ساتھ اور پچھلی دیوار کی طرف اُگے ہوئے نیم کے پیڑوں کا جو سایہ آنگن میں پڑتا تھا وہ پورے گھر کو گلی سے علاحدہ کر کے ایک منفرد اور ممتاز مکان کا روپ دے رہا تھا۔

گلی تک جانے والا بیرونی راستہ اگرچہ کچا اور کیچڑ بھرا تھا لیکن کریم میاں نے منت سماجت کر کے ٹیکسی والے کو گلی کے موڑ تک لانے پر تیار کر لیا تھا۔ نکڑ پر حسو دائی کا گھر تھا۔ وہ دروازے پر بیٹھی گوبر کے اُپلے بنا رہی تھی —— اسے اندر بھیج کر کریم نے اپنی بڑی بیٹی کو بلوا لیا تاکہ وہ کپڑے، ادویات کی پٹی اور برف کی تھیلی کو ٹیکسی میں سے نکال کر کے اندر گھر لے جائے۔ خود اس نے بے سدھ پڑے بچے کو اٹھا کر اپنے کندھوں پر ڈال لیا تھا۔

دہلیز پر پاؤں رکھتے ہی جب کریم کی دونوں بیویاں "ہائے اللہ'' کہہ کر ایک کوٹھری میں چارپائی بچھانے لگیں تو کریم نے دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا —— ''یہ میرا یار بھی ہے اور میرا بیٹا بھی۔ اگر تم دونوں اس کی عیادت اور تیمارداری کر کے اسے اچھا کر دو تو اے نیک بیبیو! میں آپ کا بے حد شکرگزار رہوں گا۔''

تولیے میں لپٹی برف بچے کے سر کی طرف رکھتے ہوئے جب کریم نے ایک بیوی کو کالے

چنوں کا شوربہ تیار کرنے کو کہا تو اسے یاد آیا کہ وہ راستے میں سنگترے لینا بھول گیا تھا۔

پچھتاوے کے سے انداز میں کریم نے اپنی بیٹی سے کہا... جاؤ دوڑ کر جاؤ شیریں! شاید ٹیکسی والا ابھی تک موجود ہو، کہہ رہا تھا کہ گاڑی کا انجن گرم ہو گیا ہے، پانی ڈال کر اسے ٹھنڈا کرے گا۔

شیریں گلی کی سمت دوڑی اور جب کچھ دیر بعد لوٹی تو اس کے ہاتھوں میں چار سنگترے تھے۔ ''ابا! ٹیکسی والا تو جا چکا تھا، میں چچا نذیر کے یہاں سے سنگترے لے آئی ہوں۔''

کریم کو پہلے اس کا خیال ہی نہیں رہا لیکن جب اس کی بیٹی نے نذیر کا نام لیا تو اسے یاد آیا کہ وہ تو سنگترے کی چھابڑی لگایا کرتا ہے۔

''چچا گھر پر نہیں تھے —— وہ تو چھابڑی لے کر شہر گئے ہوئے ہیں۔ میں چاچی زینت سے مانگ لائی ہوں۔''

لڑکی نے جب بتایا تو کریم کے چہرے پر طمانیت کی ایک جھلک اُمڈ آئی۔ لڑکی کے سر پر محبت کا ہاتھ رکھ کر کہنے لگا: ''میں نہیں جانتا تھا کہ تم اتنی عقلمند ہو... لو اب یوں کرو، اب اور برف تو کہیں سے ملے گی نہیں اور ٹونٹی کا پانی گرم ہو گا، تم کنوئیں سے پانی کی بالٹی کھینچو اور ٹھنڈے پانی میں پٹیاں بھگو کر مجھے دیتی جاؤ۔''

رات بہت بیت چکی تھی۔ کریم کو محسوس ہوا کہ بچے کے بدن کی حرارت تو ٹوٹ چکی ہے مگر نہ تو ابھی تک اس نے آنکھیں کھولی تھیں اور نہ ہی منہ سے کچھ بولا تھا۔ لیکن نقاہت بخار سے زیادہ نڈھال بدن کا تاثر مرتب کر رہی تھی۔

کریم نے کئی بار اس کے منہ کے قریب ہتھیلی لے جا کر اس کی سانسوں کو محسوس کیا تھا جواب بہت مدھم تو تھیں لیکن اکھڑی اکھڑی نہ تھیں۔ کریم نے جب جب دوائی کا چمچہ اس کے منہ میں انڈیلا، تو دوائی بھی حلق میں اتر گئی تھی۔ سنگتروں کے رس کی معمولی مقدار بھی اور چنوں کے شوربے کی آدھی کٹوری بھی۔

اور کریم اب صبح کی طرح گھبرایا ہوا نہیں تھا۔ چنانچہ جب اس نے لگاتار کئی گھنٹوں سے بچے کے سرہانے بیٹھنے کی تھکن کو انگڑائی لے کر توڑا تو سامنے کی دیوار کے پائیں سوئی ہوئی اس کی ایک بیوی جاگ گئی۔ اٹھ کر پاس آئی اور بولی: ''اب جاؤ گھڑی بھر کے لیے بدن سیدھا کر لو۔ میں

تمہارے اس بیٹے کے پاس بیٹھتی ہوں۔"

کریم مسکرادیا—— "اچھا برکت! تمھیں بھی میری تکلیف کا احساس ہے۔"

"آج تمھیں کسی کے درد کو محسوس کرتے جو دیکھ لیا ہے، ورنہ میں تو سمجھتی تھی کہ تم بھی سنگریزے کی طرح کسی دال کے بیچ گلنے والے نہیں ہو۔" برکت نے کچھ چبھنے والے لہجے میں کہا۔

کریم نے ہنس کر اپنی بیوی کی تلخی کا وار سہہ لیا اور کہنے لگا: "سچ کہتا ہوں اگر اس شخص کو کچھ ہو گیا تو میں زندہ نہیں رہوں گا۔"

کریم نے چارپائی پر لیٹ کر گھنٹہ بھر کے لیے ہی نیند لی تھی۔ جب اس کی بیوی نے گھبرا کر اسے جگایا، اٹھ کر دیکھو، اس نے آنکھیں کھولیں، پھر چاروں طرف نظریں گھمائیں، کچھ بولا بھی تھا مگر میرے پلّے کچھ نہیں پڑا..."

کریم بہ عجلت اٹھا اور بنجے کے پہلو کی جانب بیٹھ کر کہنے لگا: "دیکھو یار بنجے، میں تمھیں کہاں لے آیا ہوں، دیکھ...

اب بنجے نے آنکھیں کھولیں، پہلو میں پڑے لکڑی کے اسٹول کو دیکھا جس پر پانی کا گلاس، شوربے کا پیالہ اور ایک سنگترہ پڑا ہوا تھا۔

کچھ دوں؟ کریم نے جلدی سے پوچھا اور چوبی اسٹول کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

بنجے کی آواز کانوں میں پڑی—— "تم لوگ روز میرے کھانے کے لیے کچھ رکھتے ہو؟"

کریم مسکرادیا—— "آج تو پہلا دن ہے؟"

کریم کو لگا—— بنجے اسٹول سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف دیکھ رہا ہے لیکن پہچان نہیں رہا، کہہ رہا تھا: "یہ سب اوہام کی باتیں ہیں..."

کیسے اوہام؟ کریم نے کچھ گھبرا کر پوچھا۔

"یہی کہ جس جگہ کسی کی موت واقع ہوئی ہو، اس کی روح ہر روز کچھ کھانے کے لیے وہاں جاتی ہے... لوگ ہر روز اس کی روٹی رکھ دیا کرتے ہیں... پورے انچاس دن تک... لیکن میرا اب کوئی جسم نہیں، فقط روح ہے اور روح کا ہاتھ نہیں ہوا کرتا کہ روٹی کھا سکے..." بنجے نے کہا تو کریم بہت پریشان ہو اُٹھا۔ جلدی سے بنجے کا ہاتھ تھام کر اسے ہلا دیا اور کہنے لگا: "یار بنجے! تمھیں کچھ نہیں ہوا—— یہ دیکھو تمہارا ہاتھ، یہ تمہاری پیشانی، شانے، ٹانگیں... تمہارا مکمل جسم ہے ماشاءاللہ۔"

"نہیں—— یہ میرا جسم نہیں۔" بنجے نے تیزی سے سانس لیتے ہوئے کہا: "یہ تم نے میری موت کے بعد میرا مجسمہ بنوایا ہے... میرا جسم تو آپ لوگوں نے نذرِ آتش کر دیا تھا..."

کریم چیخ سا اُٹھا "نہیں بنجے نہیں!"

"میں نے خود دیکھا تھا۔"

"کب؟"

بنجے کی آواز رُک گئی۔ جیسے وہ کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو لیکن یاد نہ آ رہا ہو۔

"کب—— کب" کریم نے پھر گھبرا کر کہا تو بنجے کو کچھ یاد سا آنے لگا، کہنے لگا: "جب بینا کو بھی لکڑیوں پر رکھ کر جلایا گیا تھا۔"

کریم کو لگا—— اس نے بنجے کی حواس باختگی کا سبب جان لیا ہے۔ دھیرے سے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بولا: "میرے یار! مرنے والوں کے ساتھ مٹی نہیں ہو جایا کرتے۔ بینا تو سچ مچ مر گئی... لیکن تم زندہ ہو، دیکھو اس طرح کی باتیں نہ کرو... تم تو یہاں میرے پاس ہو، اپنے کریم کے پاس...

"نہیں... بینا کے پاس... میں نے ابھی اسے دیکھا تھا۔"

کریم کو لگا—— اگر وہ اس وقت کسی اور بات کے بجائے صرف بینا کی ہی باتیں کرے تو شاید بنجے کو کھوئے ہوئے حواس واپس مل جائیں۔

پوچھنے لگا—— "اچھا تم نے بینا کو دیکھا تھا؟ کہاں تھی؟"

بنجے کی آواز آئی: "بہت دور سے دیکھا تھا، نیلی روشنی کے قرے میں۔"

"وہ نیلی روشنی کس کی تھی؟" کریم نے نہایت سادہ اور فطری لہجے میں پوچھا۔

"نہ جانے کس کی ہے... اب بھی نظر آ رہی ہے، چاروں طرف... ہری ہلکی نیلی دودھیا سی..."

"لیکن کس کی روشنی؟"

"معلوم نہیں... یہ سورج کی ہے، نہ چاند کی ہے، نہ آگ کی ہے۔"

"تو تم کہاں بیٹھے ہو؟"

"بیٹھا ہوا نہیں، میں اس روشنی میں تیر رہا ہوں۔"

''وہ پانی جیسی ہے کیا؟''

''نہیں ہوا جیسی۔''

''لیکن ہوا میں تو پروں والے طائر ہی پرواز کرتے ہیں؟''

''ارواح بھی۔''

''اور وہاں بیتا بھی ہے۔''

''میں نے اسے دیکھا تھا... بہت فاصلے سے... ابھی تلاش کرلوں گا۔''

''اس نے کس طرح کا لباس پہنا ہوا ہے؟''

''روحوں کے بدن پر لباس نہیں ہوتا۔''

''کس طرح لگ رہی تھی، ویسی ہی من موہنی اور دلکش۔''

''روحوں کا بدن بھی نہیں ہوتا۔''

''پھر تم نے اسے کیسے پہچانا؟''

''روحیں، روحوں کی شناخت کرسکتی ہیں۔''

''لیکن کیسے؟''

''ان کا بدن ہوتا ہے لیکن آگ اور باد سے مرکب... گوشت پوست نہیں ہوتا...''

''اور تمہارا بدن؟''

''وہ بھی آتش و باد کا آمیزہ ہے... وہ مجھے ضرور پہچان لے گی۔''

''اور وہاں کیا ہے؟''

''کچھ نہیں —— صرف چاروں طرف نیلی روشنی ہے...''

اور ننجے کی باتیں سن کر کریم کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔

پو پھٹتے ہی کریم ایک ڈاکٹر کو بلا لایا، وہ راستے بھر اسے بتارہا تھا کہ یوں تو بخار ہی تھا، بہت شدت کا، سر پر برف رکھی گئی، دوا دی تو بخار بھی اترا ہوا محسوس ہوا لیکن بدن سے الحتی ہوک کم نہیں ہوتی ڈاکٹر صاحب۔

لیکن جب ڈاکٹر گلی میں سے گزر کر کریم کے دروازے تک پہنچا تو کریم نے چوکھٹ عبور

کرکے، اسے ہاتھ کے اشارے سے روک لیا۔

ڈاکٹر دیوار کے پاس ساکت ہوکر رہ گیا تو کریم مخمصے میں پڑ گیا کہ وہ ڈاکٹر سے سب کچھ کہے یا نہ کہے لیکن اس کی خود کلامی بھی جاری تھی۔

''مریض کے متعلق کچھ اور کہنا چاہتے ہو؟'' ڈاکٹر نے پوچھا تو کریم کے منہ سے نکلا... جی.... ہاں... اور پھر آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی۔

''بیماری کی تشخیص درست ہوئی تو تجویز بھی درست ہوگی۔''

''جی، ہاں... میں بھی یہی سوچ رہا ہوں... اسی لیے تو۔''

اور کریم نے کچھ جھجکتے ہوئے ڈاکٹر کو بتایا: ''بات یہ ہے جی —— آدمی بہت ذہین ہے، لیکن حساس کچھ ضرورت سے زیادہ ہے... میرا خیال ہے کہ لڑکی کی موت کو اس نے دل پر لگالیا ہے۔

''کون؟ اس کی بیوی تھی؟''

''نہیں جی... یہ تو ابھی کنوارہ ہے۔''

''اس کے ساتھ اس کی شادی ہونے والی تھی؟''

''نہیں جی... وہ تو شادی شدہ تھی...''

''تو پھر وہ کون تھی؟'' ڈاکٹر نے کچھ حیران ہوکر کریم کی طرف دیکھا تو کریم کو محسوس ہوا —— کہ وہ صاف صاف کہنے کے بجائے خود ہی دیوانوں کی سی باتیں کررہا ہے...

''کیا کسی حادثے میں اچانک اس کی موت واقع ہوگئی؟'' ڈاکٹر نے کریم کی خاموشی دیکھ کر بات آگے بڑھانے کے لیے پوچھا۔

کریم پھر بوکھلا سا گیا۔ ''نہیں جی... اسے جس قسم کا روگ لاحق تھا، اس میں بچنا محال تھا... لیکن وہ تو زندگی کی تمام تر رعنائیوں سے سرشار تھی... اور پھر کریم خود کو ملامت سی کرتے ہوئے کہنے لگا: ''دراصل اس کی بیماری نے خود مجھے بھی پاگل کردیا ہے... بات صرف اتنی ہے کہ وہ کسی لڑکی سے محبت کرتا تھا لیکن زندہ نہ رہ سکی... لگتا ہے اسی صدمے نے اس کو نیم جان کررکھا ہے ڈاکٹر صاحب!''

''کوئی فکر کی بات نہیں، ٹھیک ہوجائے گا، چلیے مریض کے پاس۔'' ڈاکٹر نے کہا تو کریم اسے اندر کمرے میں ننجے کے پاس لے گیا۔

ڈاکٹر نے نبض دیکھی۔ بلڈ پریشر لیا، سانس کا معائنہ کیا۔ بنّے نے ایک دوبار آنکھیں کھول کر دیکھا بھی۔ لیکن نہ تو اس کی آنکھوں میں شناسائی کا کوئی رنگ تھا اور نہ ہی ہونٹوں پر کوئی سوال۔

''جسم میں کسی جگہ درد محسوس کرتے ہو؟'' ڈاکٹر نے کئی بار دوہرا دوہرا کر پوچھا تو بنّے کے چہرے پر تناؤ سی کیفیت عود عود کر آتی رہی۔ جیسے اس کے دھیان میں ڈاکٹر کی آواز نے خلجان برپا کرنے کی کوشش کی ہو۔

اور جب ڈاکٹر نے بنّے کا بازو اچھی طرح جھنجھوڑ کر یہی سوال دوہرایا تو بنّے نے بہت آہستگی سے کہا: ''درد؟ کہاں؟ کہیں نہیں، کوئی درد نہیں...''

''سر میں؟ یا ٹانگوں اور بازوؤں میں؟''

میرا سر گوشت پوست کا نہیں اور نہ ہی ٹانگیں اور بازو، درد ہو ہی نہیں سکتا، بنّے نے کہا تو ڈاکٹر نے متحیر ہو کر پہلے اس کی طرف دیکھا اور پھر کریم کی طرف۔

ڈاکٹر نے اپنے ہاتھ بنّے کی آنکھوں کے آگے لے جا کر پوچھا: ''اچھا، یہ کیا ہے؟ نیلی روشنی، سلیٹی سی... بادلوں جیسی۔''

ڈاکٹر نے کمرے میں چاروں اور نگاہ دوڑائی، پھر دہلیزوں کے پاس کھڑی ہوئی کریم کی بیٹی پر نگاہ پڑی تو دیکھا کہ اس کے دوپٹے کا رنگ گہرا سرخ تھا۔ ڈاکٹر نے لڑکی کو پاس بلایا اور اس کے دوپٹے کو اس کی آنکھوں کے آگے کر دیا اور پوچھا: ''یہ کون سا رنگ ہے؟''

''نیلا، گہرا نیلا اور چمک دار۔''

ڈاکٹر نے ایک انجکشن دیا۔ دوا دی اور کریم سے کہنے لگا۔ ''شاید کچھ دنوں تک روزانہ انجکشن دینا پڑے۔ یہ دوا چار چار گھنٹے کے وقفے سے دیتے رہنا۔ کل صبح میں خود ہی آ کر انجکشن دے جاؤں گا۔ لیکن اگر شام کو رات کے وقت حالت زیادہ خراب ہو جائے تو مجھے اطلاع دینا... اس وقت بخار بالکل نہیں ہے۔''

کریم ڈاکٹر کے ہمراہ واپس لوٹ گیا... دوائیں لانے کے لیے۔ راستے میں اس نے بڑے نرم لیکن بلند لہجے میں پوچھا: ''مجھے صاف صاف بتایئے ڈاکٹر صاحب! کوئی خطرے والی بات تو نہیں؟''

ڈاکٹر نے لحہ بھر کے لیے سوچا اور پھر کہنے لگا ''میرا خیال ہے۔ نہیں، آپ نے درست ہی کہا تھا کہ صدمے کا وار بہت کاری لگا ہے۔ لیکن کیا آپ نے ایک بات کی طرف دھیان دیا تھا؟

کیا؟

جب میں نے صرف اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تو اس نے کہا تھا: ''نیلی روشنی ہے سلیٹی سی، بادلوں جیسی۔''

''یہ تو وہ گذشتہ نصف شب سے کہہ رہا ہے۔''

نہیں میں اور بات کہہ رہا ہوں اور پھر جس وقت لال رنگ کا دوپٹا اس کی آنکھوں کے آگے لایا گیا تھا تو اس نے کہا تھا ــــ یہ نیلا رنگ ہے، بہت گہرا چمک دار...

''جی ہاں۔''

سو اس کا مطلب ہے کہ پہلے اسے ہلکا نیلا رنگ دکھائی دے رہا تھا لیکن دوپٹے کے گہرے رنگوں نے صرف اس پر کوئی اثر مرتب کیا تھا۔ جس کے تحت پھیکا رنگ گہرا ہو گیا تھا۔

''آپ کا مطلب ہے کہ کہیں ہوش کی چنگاری ابھی سلگ رہی ہے۔''

''ہاں بہت دھیمی موہوم سی... لیکن ہے۔''

اور ساتھ ہی، بات کا جواب بھی تو دیتا ہے۔ خواہ جواب کچھ اور ہی ہوتا ہے لیکن اسے ہماری بات کسی حد تک سنائی دے ہی جاتی ہے جبھی جواب دیتا ہے...

''بالکل۔''

رات کے وقت جب اس نے نیلی روشنی کی بات کی تھی تو یہ بھی کہا تھا کہ وہاں بیتا بھی دکھائی دیتی ہے۔

''بیتا کون؟''

''وہی، جس کی بابت میں نے بتایا تھا۔''

''جس کی موت کا صدمہ بتا رہے تھے آپ۔''

''جی ہاں۔''

شاید... ڈاکٹر کسی سوچ میں پڑ گیا تھا، پھر کہنے لگا...

''شاید اس موت کو اس نے خود پر طاری کر لیا ہے۔''

"کیا مطلب؟"

"یہی کہ اسے لگ رہا ہے کہ اصل میں یہ موت لڑکی کی نہیں، خود اس کی اپنی ہوئی ہے۔"

"لیکن جناب —— اس کی موت بھی اس کے ذہن میں محفوظ ہے۔"

"کس طرح؟"

اس کے خیال میں... اب اس کی روح آسمانوں پر ہے جہاں جا کر اس نے بینا کی روح سے ملاقات کی ہے۔

"اس کا مطلب ہے کہ اسے اس کی موت یاد ہے۔"

ڈاکٹر نے اتفاق رائے کے انداز میں سر ہلایا۔ پھر ذرا ٹھٹھک کر بولا: "دو دن تک دیکھتے ہیں، اگر کوئی بہتری رونما نہ ہوئی تو ہسپتال لے جانا پڑے گا۔"

کریم جب دوا لے کر واپس آیا تو نجے کو اسی طرح چت لیٹے پایا۔ اس نے ہاتھوں سے نجے کا بدن ٹٹولا۔ سانس کو محسوس کیا۔ بخار میں تیزی کا احساس نہیں تھا۔ جیسے ڈاکٹر نے کہا تھا، کریم نے دودھ کا آدھا پیالہ ایک ایک چمچ کر کے اس کے حلق میں انڈیلا اور پھر دوا پلا دی۔

تب نجے کے پہلو کے قریب بیٹھتے ہوئے کریم کو ڈاکٹر کی وہ بات یاد آ گئی کہ کہیں ہوش کی چنگاری ابھی باقی ہے۔ اس نے جلدی سے اپنی بیٹی شیریں کو بلا کر کہا کہ وہ برابر کی گلی میں اتنے مالی کے گھر سے تھوڑے سے پھول لے آئے۔ اسے معلوم تھا کہ اتنے مالی کی بیوی گھر میں پھولوں کے گجرے پروتی ہے، جنھیں اس کا بیٹا شام کے وقت انڈیا گیٹ کے چوراہے پر جا کر بیچتا ہے۔

کریم نے آہستہ آہستہ نجے کے ساتھ نیلی روشنی کی باتیں چھیڑ دیں۔ نجے بہت دیر تک چپ رہا، جیسے وہ کوئی بیرونی آواز نہ سن رہا ہو۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے ہونٹ پھڑکنے لگے۔ کریم نے پوچھا: "یار! تم وہاں اکیلے ہی ہو یا کوئی اور بھی ہے۔"

"اور بھی بہت سی ارواح۔" نجے نے بہت دھیمے لہجے میں کہا۔

کریم کو نجے کی آواز بہت دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے چارپائی کے پائے کے ساتھ لگ کر بیٹھتے ہوئے اپنا سر نجے کے سرہانے کے ساتھ لگا کر اپنا منہ اس کے کانوں کے قریب کر لیا۔

پوچھا: "تم دیکھ رہے ہو کہ اور کون کون سی ارواح ہیں؟"

"نہیں۔"

"کہیں کریم بھی نظر آتا ہے کہ نہیں؟"

"کون؟"

"کریم... تمہارا دوست ہوا کرتا تھا، کریم وقار۔"

"نہیں، وہ تو زمین پر ہو گا۔"

"اور تم اکیلے وہاں تھک نہیں گئے ہو؟"

"نہیں، روحیں نہیں تھکتیں، روحوں کے ارد گرد کا ہونا نہیں ہوتا۔"

کریم کی بیٹی موتیے کے پھولوں کا ایک گجرا لے آئی تو کریم نے پھولوں کا وہ گجرا نجے کی سانسوں کے آگے رکھ کر آہستہ سے پوچھا: "کیا وہاں ابھی بینا سے ملاقات ہوئی ہے یا نہیں؟"

نجے بہت دیر تک چپ رہا۔ پھر اچانک بول پڑا۔ "وہ بینا دکھائی دے رہی ہے۔ وہ ادھر، درمیان میں سے دوسری روحیں گزر رہی ہیں۔ وہ ادھر ہے، مجھے خوشبو آ رہی ہے، آج بینا نے اپنے بالوں میں پھول لگا رکھے ہیں۔"

کریم نے ایک گہری اور ٹھنڈی سانس کھینچی۔

وہ آج کام پر نہیں جا رہا تھا، رخصت کی درخواست بھجوا دی تھی۔ ذرا اپنے جسم کو آرام دینے کے لیے وہ نجے کی چارپائی کے پاس دری بچھوا کر لیٹ گیا۔

"کریم میاں!" نجے کی آواز بہت زور سے کریم کے کانوں سے ٹکرائی اور ہڑبڑاہٹ کے عالم میں اس کی نیند کھل گئی۔

وہ ہڑبڑا کر اٹھنے لگا تو اس کا ٹخنہ چارپائی کے پائے سے ٹکرایا اور اس کے پورے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی، لیکن اس نے ایک ہاتھ سے ٹخنہ سہلاتے ہوئے تیزی سے دوسرا ہاتھ نجے کی پیشانی پر رکھا اور کہا: "یہ دیکھو میں تمہارے پاس کھڑا ہوں۔"

لیکن لگا —— نجے کو اس کی آواز سنائی نہیں دی تھی۔

نجے کچھ کہہ ضرور رہا تھا لیکن اس سے نہیں کسی اور سے۔

کریم نے اس کی آواز پر کان لگا دیے۔ اب وہ بہت آہستہ آہستہ بول رہا تھا وہ کہہ رہا تھا: "یار نجے! موت کے فرشتے نے درست کہا تھا کہ اسے شیشے میں دیکھو، اس میں تمھیں پہلے جنم

کا سب کچھ دکھائی دے گا۔ میں نے ابھی شیشے میں کریم کو دیکھا تھا...اسے دیکھ کر میں تو بھول ہی گیا کہ وہ پچھلے جنم کی بات تھی... میں نے اسے بہت زور سے پکارا تھا۔

کریم کو علم تھا کہ جب کبھی ننجے اپنے آپ سے مخاطب ہوتا تھا تو ہمیشہ خود سے یار ننجے کہہ کر بات کیا کرتا تھا اور اب بے ہوشی کے عالم میں وہ اپنی عادت کو بھول نہ سکا تھا اور خود سے مخاطب ہو کر باتیں کر رہا تھا۔

تب دوست ننجے خاموش ہوتا نظر آیا تھا۔ کریم نے کریم بن کر نہیں شیشہ والے فرشتے کی جگہ لے کر کہا: ''دیکھا! میں نے تجھے کیسا شیشہ لا کر دیا ہے، تم اس میں سے اپنے پہلے جنم کی بابت جو چاہو دیکھ سکتے ہو۔''

''اچھا، لاؤ پھر دیکھیں۔'' ننجے کی آواز آئی اور پھر اس آواز میں تیزی آ گئی۔ ''سچ مچ اس میں سے مجھے اپنا کریم میاں نظر آ رہا ہے... یہ میرا بہت اچھا دوست ہوا کرتا تھا۔''

''پھر تم یہ نہیں چاہتے کہ تمہارا دوست بھی یہاں آ جائے تمہارے پاس۔''

''نہیں نہیں اسے ابھی دنیا میں رہنے دو، اس کی دو بیویاں ہیں، اُن پر کیا بیتے گی اس کے بعد، اس کے بال بچے ہیں، انھیں کون پالے گا؟''

''لیکن تم اس سے بات چیت کیوں نہیں کرتے، دیکھو وہ تمھیں سامنے نظر آ رہا ہے۔''

''وہ تو شیشے میں ہے، یار تم نے خود ہی کہا ہے کہ تم صرف دیکھ سکتے ہو بات نہیں کر سکتے۔''

''اچھا! تم نے دھرتی کے بارے میں کچھ اور دیکھنا ہے اس میں سے؟''

''بینا کو دیکھنا تھا، لیکن وہ تو دھرتی پر نہیں ہے۔''

''اس میں بیتے ہوئے دن بھی نظر آتے ہیں۔''

''میں وہ نہیں دیکھوں گا... تب بینا بیمار تھی... اور پھر کسی اور سے بیاہی ہوئی تھی وہ تو زمین کی مجبوریوں کے دن تھے۔''

''تم بینا سے ملنا چاہتے ہو؟''

''اسی سے ملنے تو یہاں تک آیا ہوں...''

''تو اس کے علاوہ زمین پر کچھ نہیں دیکھنا چاہتے۔''

''نہیں۔''

''میں یہ آئینہ لے جاؤں۔''

''ٹھہرو! میں ایک بار کریم کو پھر دیکھوں۔''

ننجے کے ماتھے پر رکھا کریم کا ہاتھ پھر لرزنے لگا۔ اس نے ہاتھ کو ایک طرف ہٹا کر ننجے کا ماتھا چوم لیا اور اس کی اپنی آواز ہی اس کی چھاتی کو چیر گئی۔

''ہوش میں آؤ ننجے! مجھے یوں رُلا رُلا کر نہ مارو۔''

سینے میں سے اٹھتے بگولوں کے درمیان کریم نے پورا دن بتا دیا۔ ایک بار بالٹی میں گرم پانی ڈال کر اور ایک تولیے کو بھگو کر ننجے کا بدن پونچھا۔ اس کے کپڑے بدلے۔ دو بار وقت ہونے پر دوا دی۔ دو بار سنگتروں کا رس پلایا۔ دو بار شوربہ۔ لیکن دن بھر ننجے نے اس کی کسی بات پر ہوں ہاں نہیں کی۔

کریم کی دونوں بیویاں —— برکت اور نعمت اپنے خاوند کی رمز پہچان گئی تھیں۔ انھوں نے کریم کی خواہش کے مطابق گھر میں کسی بچے کو بھی اونچی آواز نکالنے نہیں دیں —— لڑکیاں سیانی تھیں۔ ایک پندرہ برس کی شیریں اور دوسری تیرہ برس کی جمیلہ لیکن دونوں لڑکے چھوٹے تھے۔ ایک بارہ برس اور دوسرا بمشکل پانچ کا۔

روٹی کا لقمہ منہ میں ڈالتے ہوئے کریم نے صبح کا واقعہ اپنی دونوں بیویوں کے سامنے بیان کیا۔ دیکھو! بزعم خود وہ زندہ نہیں اور آسمان پر بالکل اکیلا ہے لیکن جب مشیت کے آئینے میں اس نے زمین کو دیکھا تو پہلے میری صورت دیکھی۔ اُسے ملک الموت نے پوچھا —— اگر تم چاہو تو تمہارے دوست کو دنیا سے بلوا لیں، تو وہ کہنے لگا —— نہیں اُسے دنیا ہی میں رہنے دو۔ اس کی دو بیویاں ہیں وہ اس کے بغیر کیا کریں گی اور پھر اسے اپنے بچوں کی پرورش کرنا ہے۔

اور کریم نے دونوں بیویوں سے کہا: ''جس نے آج تک تمہاری صورت نہیں دیکھی، اسے اس حال میں بھی تمہاری فکر ہے۔ بس اسی دوست کے دم سے تو میری دنیا آباد ہے اور تم بھی آباد ہو۔ نیک بیویو! یہ تو میں جانتا ہوں کہ میں تمہارا گنہگار ہوں لیکن اگر تم دعا کر کے خدا سے اس کی جان کی خیر مانگو تو میں بھی آئندہ آپ کو آپ کے حقوق واپس کر دوں گا۔''

کریم کی دونوں بیویوں کو علم تھا کہ ان کی شادی کریم کے باپ نے زبردستی کریم سے کی تھی۔ اس نے کبھی بھی انھیں دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ کریم کے بہت پرانے عشق سے بھی وہ

واقف تھیں۔ اس لیے ایک دوسرے کو اشارہ کیا اور کافی مقدار میں مکھن لے کر کریم کی روٹی کو چپڑتے ہوئے کہنے لگی: ''دیکھو نعمت! آدمی کو ضرورت پڑے تو وہ خدائے تعالیٰ سے بھی سودا کر لیتا ہے۔''

چھوٹی نعمت، برکت سے ذرا زیادہ باتونی تھی۔ اس لیے سیدھا کریم سے کہنے لگی۔ ''اچھا میاں پھر کرلو سودا... ہم دونوں رات کو دعا کریں گے لیکن اگر ہماری دعا قبول ہوگئی تو پھر دیکھ لینا تم نے ممتاز کی خاطر پھر ہم سے جو بیگانگی برتی ہے، اس کا صلہ کس کو دو گے، مجھے یا برکت کو؟''

کوئی اور دن ہوتا تو کریم ان کی زبان سے ممتاز کا نام سن کر دونوں کی زبانیں کھینچ لیتا لیکن آج کے دن وہ ایک خدائی معاملے کی وجہ سے کچھ بھی معاف کر سکتا تھا۔ اس لیے نہایت خنک لہجے میں بولا: ''برکت تم آج بڑی ممتاز اور نعمت تم چھوٹی ممتاز ہو۔''

کریم نے اس وقت غور نہیں کیا تھا—— کہ اس کی بڑی بیٹی شیریں اس وقت باورچی خانے میں پانی کی بالٹی رکھنے آئی۔ دروازے کے پاس کھڑی ہو کر وہ سب کچھ سن رہی تھی۔ کریم نے صرف رات کے وقت ٹرنکوں والے کمرے میں جا کر کوئی نیا تولیہ تلاش کرنے کی کوشش میں دیکھا کہ وہ دونوں ہاتھ پھیلائے خدا سے دعا مانگ رہی تھیں...

کریم الٹے پاؤں اس کوٹھری سے لوٹ گیا اور باہر آنگن کے اندھیارے میں کھڑا ہو کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔

کریم کا رقت زدہ دل خداوندِ عالم سے ملتمس تھا—— تم نے یہ رنگ بھی دکھانا تھا میرے اللہ، ممتاز بے چاری تو مجھے اب تمہارے حضور ہی دستیاب ہوگی۔ اس زمین پر تو اس نے نہیں ملنا تھا، سو نہ مل سکی... لیکن اس کی صورت، تو نے آج مجھے اپنی بیٹی کی صورت میں دکھا دی ہے۔

کریم کو لگا... کہ آج اس کے سینے کا کوئی زخم مندمل ہو گیا ہے۔

عمر بھر نے ایک زخم دیا تھا کہ اگر اُس کے اور ممتاز کے درمیان شیعہ اور سنی کی تفاوت نہ ہوتی تو دونوں پھولوں کی طرح ہنستے ہنستے ایک ہی گھر میں بسم ہو جاتے۔

ممتاز کی خالی جگہ کو پُر کرنے والی دونوں بیویاں برکت اور نعمت اسے کانٹوں کی طرح چبھتی تھیں۔ لیکن آج کریم کو اپنے سینے سے محبت کی ایسی خوشبو محسوس ہوئی... جیسے اس کے اپنے انگ انگ پر ممتاز پھولوں کی طرح لپٹ گئی ہو۔

کریم کے ہاتھ انجانے میں زمین کی طرف رینگ گئے—— جیسے اندر کمرے میں دعا مانگتی ہوئی اس کی بیٹی اس وقت اس کے سامنے ہو۔ اور وہ دونوں ہاتھوں سے اس کا سر سہلا رہا ہو۔

گو کریم بجلی کا پنکھا کرائے پر لے آیا تھا لیکن پھر جب رات قدرے خنک ہوئی تو وہ بنجے کی چارپائی باہر آنگن کی ہوادار کشادگی میں لے آیا اور اپنی چارپائی بھی پاس ہی بچھالی۔

جانے کس وقت کریم کی آنکھ لگ گئی۔ لیکن جب جاگا تو دیکھا کہ بنجے اسی طرح آنکھیں موندے پڑا ہے اور منہ بدبدا رہا ہے... جیسے آدمی خواب میں بڑبڑا رہا ہو۔ کریم اس کی چارپائی کے کنارے بیٹھ گیا۔

بنجے کی آواز کبھی صاف سنائی دے جاتی اور کبھی کچھ الفاظ جیسے واپس اس کے ہونٹوں کے درمیان جا گرتے... وہ کہہ رہا تھا کیا کہا، یہ نیلی روشنی... نیلی علم کی... اور سفید روشنی، دیوتا... وہ لوگ نہیں... مجھے خوف محسوس نہیں ہوتا... بہت چمکتی ہے...

''کیا چمکتی ہے بنجے!'' کریم نے دوہرا دوہرا کر پوچھا، لیکن بنجے کچھ بولا نہیں۔

کتنی دیر بعد بنجے کی آواز سنائی دی۔ ''چھ آدمی... سات... نہیں مجھے وہاں نہیں جانا... پیلی روشنی کس کی ہے؟ نجات کی؟... نہیں نجات نہیں... یتنا... سامنے... یتنا... سات رنگوں کی دھنک پر۔''

اور پھر بنجے نے یوں دھیمے لہجے میں ''یتنا'' کا نام لیا جیسے اس نے یتنا کے قریب جا کر آواز دی ہو...

اور پھر بنجے کی آواز نہیں آئی۔ کریم نے کافی انتظار کیا، پھر اٹھ کر اپنی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ایک خوف سا اس کی کنپٹیوں میں سنسنانے لگا۔ شاید جو رتی بھر ہوش باقی تھا... اب وہ بھی نہیں رہا تھا... جس کی تلاش میں اس کے حواس بھٹک رہے تھے، وہ مل گئی تھی اور اگر اب اسے ہوش آیا تو جو مل گئی ہے وہ پھر کھو جائے گی۔ اس لیے خدا کرے اب اسے ہوش نہیں آئے۔

کریم نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے۔ ''یا خدا! تمہاری مشیت کا فیصلہ کیا ہے؟''

اور وہ اٹھ کر بنجے کے پاؤں کے تلوؤں کو ملنے لگا۔

اسی سونے اور جاگنے کے درمیان پو پھٹ پڑی—— اور کریم کو لگا جیسے اس وقت آسمان

سے قطرہ قطرہ روشنی برس رہی ہے۔ بیرونی دیوار کے ساتھ اُگے نیم کے پیڑ کی پتیاں، آنگن کے ایک گوشے میں اس طرح جھولتی دکھائی دیتی تھیں، جیسے آنگن کے اس گوشے کی طرف ایک جھولتی ہوئی چھت پائی گئی ہو اور اس میں سے طلوع ہوتی صبح کی روشنی ریزہ ریزہ ہو کر آنگن میں گر رہی ہو۔

الٰہی تیری قدرت! کریم کے منہ سے نکلا اور اسے ہوک کے مانند ایک خیال آیا۔ ''ننھے کی روح کو شاید سکون مل گیا ہے... یہ روشنی شاید اسی کی ہے... جن کی روحیں خاکی بدن بن کر نہیں مل سکیں وہ خدا کا روپ بن کر ایک ہو گئی ہیں۔''

جب اپنی ہی آنکھوں کے نم سے کریم کا چہرہ بھیگ گیا تو اسے احساس ہوا کہ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا ہے۔ ہتھیلیوں سے اس نے اپنا منہ پونچھا اور دل ہی دل میں ایک نئی دلیل تراش لی۔ نہیں، یہ روشنی اس لیے اتری ہے کہ اب وہ ٹھیک ہو جائے گا اور دوبارہ زندگان میں شمار ہوگا۔

کریم نے اٹھ کر منہ پر پانی کا چھینٹا دیا۔ بیویاں، بچے ابھی سو رہے تھے اس نے کسی کو آواز نہیں دی اور چولہے پر چائے بنانے لگا۔

چولہے کی لکڑیوں میں سے آگ کی چھوٹی چھوٹی لویں کریم کے دل میں کتنی ہی ننھی منی سوچیں جگا گئیں لیکن ساتھ ہی ایکا ایکی دھواں سا بھی اٹھ رہا تھا۔ جو تمام لوؤں کو ایک ہی بار خاموش کرتا محسوس ہوتا تھا۔

کریم جھک کر چولہے میں پھونکیں مارنے لگا —— تو لگا جیسے کسی غیبی نفس نے چولہے میں پیش رفت کی ہے اور لکڑیوں میں سے آگ کا ایک شعلہ گہرا سرخ ہو کر چولہے میں ایستادہ ہو گیا ہے۔

اس نے حیران ہو کر سر اوپر اٹھایا تو دیکھا اس کی بیٹی شیریں اٹھ کر چولہے کے پاس آ بیٹھی تھی اور چائے کا پانی رکھ رہی تھی۔

''اٹھو ابا! میں چائے بنا دیتی ہوں۔''

لڑکی نے کہا تو کریم اٹھ کر باہر ننھے کی چارپائی کے پاس آ کھڑا ہوا۔

اسے محسوس ہوا —— ننھے پھر کچھ کہہ رہا ہے۔ اس نے کان لگا دیے، دھیمی سی آواز کانوں میں پڑی۔ ننھے کہہ رہا تھا۔ ''ہری روشنی... پھیکی سی ہری بہت گہری...

لڑکی چائے بنا کر لائی تو کریم نے چمچ سے پہلے تو ننھے کے منہ میں گھونٹ پانی کی جگہ چائے انڈیلنی شروع کر دی پھر اس نے سرہانے بیٹھ کر اس کا سر اونچا کر لیا —— اپنے کندھوں تک اور اسے چارپائی پر بٹھانے کے سے انداز میں لا کر —— پیالہ اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

پیالے کی چائے کم ہو گئی تو کریم نے بیٹی کو آواز دی کہ وہ کچھ اور چائے انڈیل دے۔

کریم کے ہاتھ کا پیالہ ننھے کے منہ کے قریب تھا۔ اس لیے لڑکی نے جب قریب ہو کر سامنے کی سمت سے پیالے میں مزید چائے انڈیلی تو کریم کے کانوں میں ننھے کی آواز پھر سے آئی۔ ''لال گہری لال روشنی... بہت ہلکی... بہت گہری لال۔

صبح کی روشنی اگرچہ اب بھی بہت مدھم تھی لیکن آنکھیں رنگوں کو پہچان سکتی تھیں۔ کریم نے ذرا چونک کر لڑکی کے سر پر پڑے دوپٹے کو دیکھا —— وہی کل والا گہرے سرخ رنگ کا دوپٹہ تھا۔

کریم کی پریشانی قدرے خفیف ہو گئی —— لگا ننھے کے حواس اب بھی زمین سے ہی جڑے ہیں۔ شاید اسی لیے اسے اب ہرے رنگ کے بجائے لال رنگ کی روشنی دکھائی دی ہے۔ یہ یقیناً لڑکی کی سرخ چنریا کا اثر رہا ہوگا۔ خواہ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تک نہیں۔

ذرا دن اور بیتا تو کریم ڈاکٹر کی طرف چل دیا۔ اسے پتہ تھا کہ اگر وہ وہاں نہ بھی جائے تو بھی ڈاکٹر صاحب آ ئیں گے۔ وہ کل کہہ گئے تھے لیکن دل کی طرح پاؤں کو بھی چین نہیں تھا۔

پاؤں کو ڈاکٹر کے کلینک جانے والے راستے پر ڈال کر کریم جب ڈاکٹر کے ہاں پہنچا تو اس کا بیگ اٹھاتے ہوئے کہنے لگا۔ ''آپ کے احسانات کا قرض اتاروں گا ڈاکٹر صاحب! آپ اپنی پوری صلاحیت صرف کر دو، جو آپ کے بس میں ہے۔''

مریض کا حال کیا ہے؟ دروازے سے باہر نکلتے ہوئے ڈاکٹر نے پوچھا اور دروازے کے پاس رُک گیا۔

اسی طرح... بالکل کوئی فرق نہیں۔ صرف یہی فرق ہے کہ بخار محسوس نہیں ہوتا۔ کریم نے کہا اور باہر ٹیکسی کی طرف بڑھا۔

''ایک منٹ۔'' ڈاکٹر نے کہا اور وہیں دروازے کے پاس ایستادہ رہا۔

کریم اس کی طرف آ گیا ڈاکٹر نے اس سے کہا: ''آپ کا نام کریم قادر ہے نا۔''

''جی ہاں۔''

"مریض کا نام آپ نے بنجے لکھوادیا تھا۔"

"جی ہاں۔"

"لیکن آپ مسلمان، وہ ہندو۔"

"جی ہاں۔"

"میرا مطلب ہے۔ اگر اس کی حالت بگڑ گئی۔ کچھ بھی ہو سکتی ہے تو اس کا ذمہ دار کون ہوگا؟"

"بھلے بُرے کا مالک اللہ ہے... بندہ کیا کر سکتا ہے جناب!"

"آپ سمجھے نہیں... ہسپتال میں داخل کروانا پڑا تو وہاں دستخط کون کرے گا؟"

"میں کروں گا جناب!"

"لیکن آپ اس کے کچھ نہیں لگتے۔ دستخط تو کسی رشتہ دار کو کرنا پڑتے ہیں۔"

"آپ ان باتوں میں نہ پڑیں۔ ڈاکٹر صاحب، وہ ٹھیک ہو گیا تو اسی سے پوچھ لینا کہ میرا اس سے کیا رشتہ ہے۔"

"وہ تو میں سمجھتا ہوں لیکن قانون اس رشتے کو تسلیم نہیں کرتا۔"

کریم کے دل میں ایک ہول سا اٹھا۔ ماتھے پر ایک سلوٹ سی ابھری اور کہنے لگا۔ "وہ کیسے قانون ہیں جو محبتوں کے رشتوں کو تسلیم نہیں کرتے۔"

ڈاکٹر کے چہرے پر کریم کی سی سوچ نہیں ابھری۔ وہ دنیا کی... اور صدیوں سے ماتھوں میں رینگتی سوچ کے مطابق کہنے لگا۔ "اچھا ہوتا اگر آپ اس وقت اس کے گھر والوں کو اطلاع دے دیتے اس کے ماں باپ کو۔"

"اس کے ماں باپ نہیں ہیں۔"

"کوئی بھائی بہن ہوں گے؟"

"بہن کوئی نہیں، ایک بھائی ہے لیکن سوتیلا، جو کئی برس سے اس سے نہیں ملا۔"

"لیکن اس وقت اسے اطلاع دینا ضروری ہے۔"

"میں نہیں جانتا، وہ کہاں رہتا ہے اور نہ ہی مجھے اس کا نام پتہ معلوم ہے۔"

"کہیں سے معلوم کیجیے۔"

"جناب میں کہاں سے معلوم کروں؟"

"پھر؟"

"سب کچھ خدا پر چھوڑ دیجیے۔"

سوچ لیں —— کل کلاں یہ ہندو مسلمان سوال بھی بن سکتا ہے۔"

"بننے دیجیے جناب! اگر بنتا ہے تو۔"

"لیکن آپ کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں جناب —— اگر اسے کچھ ہو گیا تو ہم کون سا زندوں میں باقی رہیں گے۔"

ڈاکٹر باہر کھڑی ٹیکسی کی طرف بڑھا۔ کریم بھی اس کا بیگ اٹھائے ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ ٹیکسی چل دی —— تو کریم کو وہ وقت یاد آ گیا جب بیمار بیتا کو اس کے خاوند نے ایک کمرہ لے کر اسے گھر سے باہر نکال دیا تھا۔ اس جیتی جاگتی کا وارث کوئی نہ بنا۔ لیکن جب مر گئی تو قانون کو ہاتھ میں لے کر اس کے وارث آ کھڑے ہوئے۔

ٹیکسی جس طرف بھی مڑتی سڑک کے دونوں جانب مکانوں کی قطاریں دکھائی دیتیں۔ کریم کبھی داہنی جانب دیکھتا اور کبھی بائیں جانب۔ اسے لگ رہا تھا جیسے کہیں بھی کوئی زندگی کا وارث نہیں۔ سب جگہ لوگ موت کے وارث ہیں۔

ڈاکٹر اور کریم جب بنجے کے پاس پہنچے تو کریم نے ڈاکٹر کو صبح کی رگوں والی بات بتائی۔ ڈاکٹر نے نبض دیکھی۔ سانسوں کی رفتار دیکھی۔ تھرمامیٹر لگایا اور پھر انجکشن دینے لگا۔

کریم نے بتایا: "آج صبح میں نے اسے بٹھا کر چائے پلائی تھی، پیالے کے ساتھ۔"

بنجے کے اعضا میں کوئی حرکت نہیں تھی۔ ڈاکٹر نے اس کے ہاتھ، بازو، پاؤں کئی بار اٹھا کر اور ہلا کر دیکھے۔ بنجے نے اس کے حرکت دینے پر کوئی ردعمل نہیں کیا۔ جیسے تمام اعضا اس کے نہ ہوں کسی اور کے ہوں۔

آج دودھ اور شوربے کے ساتھ تھوڑی سی روٹی بھی دے دینا یا پتلے سے چاول پکا کر ڈاکٹر نے کہا اور بنجے کو ہلانے کی کوشش کرنے لگا۔

کوئی فرق محسوس ہوتا ہے کیا؟ کریم نے بے چین ہو کر پوچھا: "ہاں تھوڑا سا۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"کیسا فرق؟ ہمیں تو محسوس نہیں ہوا۔" کریم اور آگے ہو کر بنجے کے چہرے کو غور سے

دیکھنے لگا۔

"شاید آپ نے غور نہیں کیا۔ آپ جب بازو میں سوئی چبھوئی گئی تو اس کا منہ ذرا کس سا گیا تھا۔ جیسے اس نے سوئی کے درد کو محسوس کیا ہو... کل ایسا نہیں ہوا تھا۔" ڈاکٹر نے بتایا۔

ڈاکٹر چلا گیا تو کریم نے دودھ کے پیالے میں ڈبل روٹی کا ایک ٹکڑا ڈال کر چمچہ بھر شکر ڈالی اور اسے چمچے سے حل کرتا، بنجے کے سرہانے بیٹھ کر اپنی چھاتی کا سہارا دے کر اسے صبح کی طرح نشست کے انداز میں لے آیا۔ اور دودھ کا پیالہ اپنے ہاتھ میں تھام کر چمچہ بنجے کے ہاتھ میں پکڑانے کا جتن کرنے لگا۔

کتنی ہی دیر بنجے کے ہاتھ کو حرکت نہیں ہوئی۔ چمچہ اس کی انگلیوں سے گر پڑتا تھا لیکن ایک بار کریم نے کچھ اچنبھے سے دیکھا کہ بنجے کی انگلیوں نے چمچہ تھام لیا ہے لیکن جب کریم نے اس کا ہاتھ اونچا کر کے پیالے کے ساتھ لگایا تو چمچہ پھر اس کی انگلیوں سے گر گیا۔

تب کریم نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ کا سہارا بھی دیا لیکن چمچہ اس کی انگلیوں میں ہی رہنے دیا اور پیالے میں سے بھر کر چمچہ اس کے ہونٹوں تک لے گیا۔

اس طرح جب کریم نے پانچ چھ بار بنجے ہی کے ہاتھ سے بھرے بھرے ہوئے چمچے اس کے منہ میں ڈالے تو غور سے دیکھا —— کہ چمچے پر بنجے کی انگلیوں کی گرفت کچھ مضبوط ہو گئی ہے۔

"یہ دیکھو یار، تمہارے ہاتھ، تمہارے پاؤں، تمہارا منہ۔" کہتے ہوئے کریم کی آواز بھر آئی۔

کریم نے اپنے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی کر دی اور دیکھا کہ بنجے نے چمچے کو ابھی تک انگلیوں میں تھاما ہوا ہے اور اس کا ہاتھ بھی پیالے کی طرف سے منہ کی طرف بڑھ رہا ہے۔

کریم کے بدن میں اس کا سانس کھل اٹھا۔

"بنجے!" کریم کے منہ سے آواز نکلی۔ اگرچہ اسے یقین نہیں تھا کہ وہ سن سکے گا۔ لیکن بنجے نے اس کا جواب دیا اور کہا: "ہاں۔"

"اب کیا محسوس ہو رہا ہے؟" کریم کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔

"تو اب آپ میرا جسم مجھے واپس دے رہے ہیں؟" بنجے نے کہا تو کریم کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

"تمہارا جسم ہمیشہ تمہارے پاس تھا، پہلے بھی" کریم کی آواز بھر آئی۔

"نہیں، پہلے نہیں تھا۔ وہ تو مذہبی تشخص کی شناخت تھی۔ مجھے موت کے فرشتے نے بتایا تھا۔" بنجے نے کہا تو کریم پھر بوکھلا گیا۔

"اس نے کیا کہا تھا؟" کریم نے گھبرا کر پوچھا۔

"یہی کہ موت کے بعد روح کو کئی دن جسم نہیں ملتا۔"

"کتنے دن؟"

"پتہ نہیں، جنم پتری کی طرح موت کا بھی زائچہ ہوتا ہے۔"

"موت کا زائچہ؟" اس میں کیا تحریر ہوتا ہے؟"

"تین جونیں۔"

"کیا؟"

"پہلی مذہب کی جون، آگ اور ہوا کا تشخص، پھر جنسی ملاپ کا تشخص۔"

"وہ کیا ہوتا ہے؟"

"جس طرح کا جسم زمین پر ہوتا ہے، اسی طرح کا پھر مل جاتا ہے۔ وہی صورت وہی شکل۔"

"تو اب تمہیں وہ مل گیا ہے؟"

"ہاں اب مجھے اپنے وہی ہاتھ پاؤں نظر آ رہے ہیں۔"

کریم کے دل کو قدرے راحت ملی کہ اور کچھ نہیں تو اس قدر فرق تو پڑا ہے کہ اب اسے اپنا جسم اپنا لگتا ہے۔

کریم نے نیم گرم پانی کی بالٹی منگوائی اور دروازہ بند کر کے بنجے کے پورے بدن کو گیلے تولیے سے پونچھا۔ پھر اسے کل کے دھلے ہوئے کپڑے پہنا کر لٹا دیا۔

شام کا ہنگامہ تھا۔ برکت باہر آنگن میں کنوئیں کے پاس کھرے میں بیٹھ کر کپڑے دھو رہی تھی اور نعمت کھچڑی کے لیے دال اور چاول بینتی اس کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔ پھر شاید اس کی آواز بلند ہو گئی یا کریم کی سماعت تیز ہو گئی تھی——

کریم نے سنا وہ کہہ رہی تھی: "جی چاہتا ہے، اس بدبخت نیم کو آری سے چیر ڈالوں... اس نے تو دن رات میرے ہاتھ میں جھاڑو تھما رکھی ہے۔ ابھی پورے آنگن کو صاف کیا تھا اور ابھی اس

کی پتیوں کا انبار لگ گیا ہے۔

جانے کیوں کریم کا دل لرز کر رہ گیا۔ لگا اس کا اپنا جسم کوئی آری سے چیرنے لگا ہے۔

صبح کے بعد اب تک بنجے نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ سارا دن کریم کے دل سے نیم کے پیڑ کی طرح پتیاں جھڑتی رہی تھیں اور اب شام ہوگئی —— نعمت کی آواز سے نیم جیسی تلخ لگی تھی۔ نیم کو چیر ڈالنے کی بات اسے ایک بہت بُرا شگون لگ رہی ہے۔

من میں غصّے کا ایک الاؤ سا اٹھا اور کریم اٹھ کر آنگن میں آ کھڑا ہوا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس وقت اس کے منہ سے کیا نکل جائے گا کہ سامنے دروازے میں سے نکل کر اس کی بیٹی شیریں اس کے پاس آ کھڑی ہوئی: ''دیکھو! ابا میں کیا لائی ہوں؟''

کریم نے دیکھا لڑکی کے ہاتھ میں کوئی پودا ہے۔ جڑ کی طرف سے مٹی میں آلودہ لڑکی کہہ رہی تھی۔ ''چاچا عطا کے گھر سے لائی ہوں، دیکھو مجھے اس نے تھوڑے پھول بھی دیے ہیں لیکن میں نے کہا، چاچا! میں بار بار پھول مانگنے آتی اچھی لگتی ہوں، دینا ہے تو پودا دے دیجیے میں آنگن میں لگا لوں گی۔ ابا! اس پر موتیے کے پھول آئیں گے۔''

کریم کے دل کو راحت مل گئی۔ لگا —— ساری بدشگونی، نیک شگونی میں بدل گئی ہے اور وہ خود بھی بیٹی کی عمر کے برابر کا ہو کر کہنے لگا: ''چلو اسے لگا دیتے ہیں... میں گڑھا کھودتا ہوں... بتاؤ کہاں لگایا جائے؟''

لڑکی نے سارے کچے آنگن کا آنکھوں سے جائزہ لیا۔

''سامنے دروازے کے پاس نہ لگائیں اندر داخل ہوتے ہی اس کے پھول نظر آئیں گے۔'' کریم نے کہا۔

''وہاں کوئی اسے پاؤں سے روند ہی نہ جائے۔'' لڑکی نے انکار میں سر ہلا دیا۔

''پھر ادھر کنوئیں والی سمت۔''

''نہیں وہاں تو ہم کپڑوں کو خشک کرنے کے لیے ڈالتے ہیں۔ پھر کُھرا بھی وہیں ہے، جہاں سارے دن جھوٹے برتنوں کا ڈھیر لگا رہتا ہے۔''

''پھر تمہارے کمرے کے پاس لگا دیتے ہیں۔ تم خود ہی پانی دینا اور خود ہی اس کی حفاظت کرنا۔''

''وہاں تو ابا! سیدھی دھوپ پڑتی ہے۔ دوپہر کے وقت میں جل بھن کر رہ جاتی ہوں۔ یہ بے چارہ تو وہاں اُگ ہی نہیں پائے گا۔''

دائیں جانب کے کمرے مشرقین کے جانب کھلتے تھے لیکن سامنے کی جانب سے ان سب پر سایہ رہتا تھا، ان میں سے آخری کمرہ جو تیسری دیوار کی جانب واقع تھا، لڑکی نے اس کی طرف دیکھا تو کریم نے جلدی سے حامی بھر لی۔

گھر میں کھرپا نہیں تھا۔ کریم نے چھینی لے کر ہی ایک چھوٹا سا گڑھا کھودا۔ لڑکی نے دوپٹے میں لپٹا ہوا پودا اس میں لگا دیا اور پھر پانی دینے لگی۔

کریم منہ سے کچھ نہیں بولا۔ لیکن مٹی والے ہاتھ دھو کر دونوں ہتھیلیاں آنکھوں سے مس کیں اور دل میں دعا کی۔ ''بیٹی! تمہارے ہاتھ ہی خوش نصیب ثابت ہوں۔ بنجے کی زندگی کا بوٹا پھر اسی مٹی میں اُگ جائے۔''

دیوار کے ساتھ ملحقہ یہی آخری کمرہ تھا جس میں اس وقت بنجے تھا۔ لیکن کریم نے اپنے من کی مرادوں کے بارے میں لڑکی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔

رات کے گہرے اندھیرے کو بنجے کی آواز چاقو کی طرح کاٹ گئی —— نہیں نہیں سات رنگوں کی کمان پر خدا نہیں ہے، وہ بیتا ہے...

کریم نے آنگن کی بتی روشن کی —— بنجے کے پورے جسم پر کپکپی طاری تھی۔ ہاتھوں میں بھی حرکت تھی اور پاؤں میں بھی...

کریم کی پیشانی سے خوف کی ایک شعاع پھوٹی۔ ''خدا جانے بنجے کے ہوش نے اب کس طبق میں قدم رکھا ہے مگر بدن ابھی تک اسی جگہ پڑا ہے۔ کون جانے... روح اور جسم پرے یکجا ہوئے ہیں کہ نہیں۔

کریم نے اس کے کان کے پاس منہ لے جا کر کہا۔ ''تم ٹھیک کہتے ہو، سات رنگوں کی کمان پر بیتا نظر آ رہی ہے، مجھے بھی...

بنجے ابھی تک غصّے میں تھا، کہنے لگا پھر ابھی تم نے کیوں کہا تھا وہ بیتا نہیں... اور یہ بھی کہا تھا...

بنجے خاموش ہو گیا تو کریم کہنے لگا: ''تم ہی کہو میں نے کیا کہا تھا۔''

"یہی کہ گہرے لال رنگ کی روشنی بہشت کی ہے اور ہلکے لال رنگ کی روشنی دوزخ کی۔

"ہاں کہا تھا..."

"لیکن میں نے کہاں نہیں جانا۔"

"پھر تم کہاں جانا چاہتے ہو؟"

"جہاں سات رنگوں کی دھنک پھولتی ہے... لیکن تم جھوٹ بولتے ہو۔"

"نہیں میں نے جھوٹ نہیں بولا۔"

"میں نے بھی سوچا تھا کہ موت کے فرشتے جھوٹ نہیں بولتے۔"

"لیکن میں نے جھوٹ نہیں بولا۔"

"پھر تم نے کیوں کہا تھا کہ وہاں بیتا نہیں ہے۔"

اب کریم کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔

تم بولتے کیوں نہیں؟ ننھے نے پوچھا تو کریم کے منہ سے نکلا۔" کہا تھا... سوچا تھا کہ تم خود چل کر بہشت دیکھ لو..."

"تم نے مجھے دور سے دکھایا تھا... دوزخ بھی دکھایا تھا، جہاں کئی آدمی ہاتھوں میں خون آلود چاقو تھامے ناچ رہے تھے لیکن مجھے بیتا کے پاس جانا ہے۔ میں تمہارے ساتھ کہیں نہیں جاؤں گا۔ تم جاؤ، چلے جاؤ۔"

ننھے نے غصے کے عالم میں اسے جانے کے لیے کہا تو کریم کو الہام جیسے ایک خیال آیا۔ وہ جلدی سے کہنے لگا۔" ننھے یار! تمھیں یاد ہے تم اپنے پچھلے جنم میں کیا کرتے تھے؟"

"میں نہیں جانتا۔"

کریم نے ننھے کی باتوں سے کچھ اندازہ لگا لیا تھا کہ ننھے کے حواس اس وقت کہاں ہیں اور یہ بھی جان گیا تھا کہ ابھی اس کے ہوش و حواس کا رخ جبری طور پر موڑ نا ممکن نہیں۔ چنانچہ وہ اندازے سے اس کے سوالوں کے مناسب جواب دیتا ہوا کہنے لگا:" میں تمھیں وہ آئینہ دکھاؤں جس میں پہلا جنم صاف دکھائی دیتا ہے۔"

"میں نے وہ بھی دیکھا تھا، اس میں اپنے کریم کو بھی دیکھا تھا..."

"پھر یہ بھی تو دیکھو کہ تم پہلے جنم میں کیا کام کرتے تھے..."

"اچھا، دکھاؤ آئینہ..."

"یہ دیکھو۔"

"ہاں مجھے یاد آ گیا —— میں ناول اور کہانیاں لکھا کرتا تھا۔"

"تو اب کیوں نہیں لکھتے؟"

"اب کس طرح لکھوں؟"

"یہاں جو کچھ ہے، وہ سب کچھ دیکھ کر۔"

"لیکن لکھوں گا کس طرح؟"

"کیوں؟ میں تمھیں کاغذ اور قلم لا دوں گا۔"

"لیکن تم نے تو کہا کہ خواہ مجھے ہاتھ پاؤں مل گئے ہیں مگر یہ زمین والے دست و پا جیسے نہیں ہوتے۔"

کریم سوچنے لگا کہ اب وہ کیا کہے۔ اسے لگا —— کہ ننھے کو کام کی سمت موڑ لانے کی جو ترکیب اس نے سوچی تھی وہ رائیگاں چلی گئی ہے۔ ننھے نے ہی کہا ——

"یہ ادیب ہونا بھی کسی عجیب بددعا کا صلہ ہوتا ہے۔"

"کیوں؟" کریم نے نہایت نرمی سے پوچھا۔

یہی کہ آدمی مر کر بھی لکھنا چاہتا ہے —— ہاتھوں کے بغیر بھی لکھنا چاہتا ہے..."

"ایک بات سنو۔"

"کہو۔"

"میں جو کچھ دیکھوں گا کہتا چلوں گا، تم لکھتے جاؤ گے۔"

"ہاں —— " کریم نے عجلت میں کہا۔

کریم کو صرف ایک ہی زبان کی معمولی شُد بُد تھی —— اردو کی ——
لیکن اس نے اس وقت اقرار کرنے ہی میں بہتری سمجھی۔

"اچھا تو تم مجھے وہاں لے چلو جہاں لوگ خون آلود چاقو تھام کر رقص کرتے ہیں، جہاں دوزخ ہے۔"

"اچھا —— لیکن یار! تم بہشت میں کیوں نہیں جاتے؟"

"وہاں بعد میں چلیں گے۔"

"اچھا،تو چلو۔"

"چلو،لیکن سنوتم کاغذ اور قلم لائے ہو۔"

"نہیں۔"

کریم سچ مچ اٹھ کر کاغذ اور قلم لے آیا۔اس کے اپنے پاس نہ کاغذ نہ قلم وہ برابر کے کمرے میں جا کر اپنے بچے کی کاپی اور پنسل لایا اور پھر ننھے کی چارپائی کے پاس نیچے فرش پر بیٹھ کر—— اچھا بولو میں کاغذ قلم لے آیا ہوں۔"

"دیکھو،دیکھو،ادھر دیکھو۔" ننھے نے بہ آواز بلند کہا۔

کریم کو کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ کس طرف دیکھے۔وہ چپ چاپ ننھے کے چہرے کو تکتا رہا۔

"عجیب بات ہے...میں نے دور سے سمجھا کہ بہت سے بچے اسکول جا رہے ہیں لیکن قریب جا کر دیکھا کہ بچے ہیں ہی نہیں—— صرف چھوٹے چھوٹے بستے ہیں،جو چلے جا رہے ہیں...دوزخ میں یہی ہوتا ہے کیا؟"

"ہاں۔"

"اگر بچے بستوں کے ساتھ نہیں جائیں گے تو وہ پڑھیں گے کس طرح؟ لیکن بات تو ٹھیک ہے...اگر بچے پڑھ جائیں گے تو وہ دوزخ میں کس طرح رہیں گے؟"

کریم ننھے کی اس منطق پر حیران سا ہو کر اس کا منہ تکنے لگا۔

"سنو!تمہارا نام کیا ہے؟" ننھے نے اچانک پوچھا۔

"میرا؟" کریم کی کچھ سمجھائی نہ دیا کہ وہ کیا کہے۔

ننھے کہنے لگا:"شاید موت کے فرشتے کا یہی نام ہوتا ہے۔موت کا فرشتہ۔"

"ہاں——"

"دیکھو،یہاں مرغوں کی لڑائی ہو رہی ہے،چلو قریب جا کر دیکھیں۔"

"چلو۔"

اچانک ننھے کے ہنسنے کی آواز آئی۔ساتھ ہی وہ کہہ رہا تھا:"سامنے دیکھو!کبھی مرغے

کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ہیں—— ایک دوسرے کو چونچیں مار مار کر کرسیوں پر واپس آ بیٹھتے ہیں، سبھی کے پروں سے لہو رس رہا ہے۔دیکھو دیوار پر کیا لکھا ہوا ہے؟"

"تم پڑھ کے سناؤ۔" کریم نے نرمی سے کہا۔

"نہیں۔"

"دیکھو،لکھا ہوا ہے کہ ان ساری کرسیوں پر دوزخ کے قوانین بیٹھتے ہیں۔"

"اوہ خدایا!..." ننھے کا چہرہ اداس ہو کر اُتر گیا۔کہنے لگا:"بھلا قانون اس لیے ہوتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کا جسم لہولہان کریں۔" اور پھر ایک ٹھنڈی سانس کھینچ کر بولا—— "میں یہ تو بھول ہی گیا تھا کہ سب دوزخ کے قوانین ہیں۔"

پھر کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی تو کریم نے سکوت کو توڑا۔بولا:"اور کیا لکھوں؟"

"ٹھہرو!سامنے دیکھو کتنا اژدھام ہے۔کوئی شخص بہت ہی اونچی جگہ پر کھڑا ہو کر بول رہا ہے،سنو!"

ننھے خاموش ہو گیا تو کریم بھی چپ ہو کر اوپر آسمان کے تاروں کو تکنے لگا۔

"رحم کر خدایا!" کریم کے منہ سے نکلا تو ننھے نے فوراً پوچھا:"کیا کہا؟"

"کچھ نہیں۔"

"نہیں،تم نے خدا کا نام لیا ہے،دیکھو جو شخص بہت اونچائی پر کھڑا ہو کر بول رہا تھا،وہ اب ہمیں گھور کر دیکھ رہا ہے،سنو!وہ کہتا ہے کہ یہاں جو بھی خدا کا نام لے گا اسے قید میں ڈال دیا جائے گا۔"

"اچھا،تو غلطی ہو گئی...میں پھر یہ نام نہیں لوں گا۔"

"دیکھو وہ کہہ رہا ہے کہ آج کل انتخابات کے دن ہیں—— جو بھی خدا اور صداقت کا نام لے گا۔اسے جیل بھجوا دیا جائے گا۔"

"لیکن کیوں؟"

"کہتے ہیں انتخابات کے دنوں میں سچ بولنا غیر قانونی اور غیر ضروری ہوتا ہے...تم خود ہی تو مجھے دوزخ دکھانے کے لیے لائے ہو اور خود ہی پوچھتے ہو،کیوں؟"

"میں نے تو لکھنے کی غرض سے پوچھا تھا۔"

نجے خاموش ہوگیا۔ پھر کہنے لگا: ''لیکن یار جب تک میں خود نہ لکھوں بات نہیں بنتی۔''

''یہ لو کاغذ اور خود لکھو۔''

''تم مجھ سے مذاق کرتے ہو، اگر میں تمہارے اس جہان کے بجائے زمین پر ہوتا تو خود ہی لکھتا... یہاں تو عجیب وغریب چیزیں دیکھنے میں آرہی ہیں۔''

''کیا؟''

''دیکھو! انتخابات والے اپنا نشان چن رہے ہیں۔''

''ہاں۔''

یہ جو خیمہ نصب ہے، اس خیمے والوں نے اپنا نشان کرسی رکھا ہوا ہے۔ چلو ذرا دیکھیں، دوسرے خیمے والوں نے اپنا نشان کیا رکھا ہے۔''

''چلو۔''

''یار کمال ہے... دوسرے خیمے والوں نے بھی اپنا نشان کرسی رکھا ہوا ہے... پہلے خیمے والوں کی کرسی سفید رنگ کی ہے اور ان کی کرسی کا رنگ سبز ہے۔''

''چلو تیسرا خیمہ بھی دیکھیں۔''

''چلو۔''

اور نجے قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا—— ''دیکھو یار! انھوں نے بھی اپنا نشان کرسی رکھا ہوا ہے۔ ان کی کرسی کا رنگ لال ہے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر میرا جی چاہتا ہے کہ میں پھر روئے زمین پر واپس چلا جاؤں گا اور اپنے ہاتھوں سے پورا حال قلمبند کروں۔''

کریم نے دایاں ہاتھ ماتھے سے چھوڑ کر آسمان کی طرف بلند کیا اور دل میں کہا: ''شکر ہے تیرا خداوندا! اس نے دوبارہ زمین پر واپس آنے کی بات تو سوچی ہے۔''

نجے کہہ رہا تھا: ''بھیانک... بہت بھیانک... سنو! ایک نقارچی اعلان کررہا ہے کہ انتخابات جیتنے والے کے گلے میں انچاس کھوپڑیوں کا ہار ڈالا جائے گا۔''

''کیا؟'' کریم نے گھبرا کر کہا۔

اور یہ بھی کہ اس کی دعوت میں رات کے وقت لوگوں کے تازہ لہو کے جام پیے جائیں گے اور دیکھو سامنے دیکھو! اس میدان میں لوگ کس طرح رو رہے ہیں۔ کچھ لوگ مل کر چھری سے ان کا

گوشت کاٹ رہے ہیں۔

''شاید ان سے کوئی خطا سرزد ہوئی ہوگی۔''

''چلو قریب جا کر دیکھیں۔''

''چلو۔''

''کمال ہے—— میدان میں بانس پر ایک بورڈ آویزاں ہے کہ یہاں لوگوں سے ٹیکس وصول کیا جاتا ہے۔''

''ٹیکس؟''

''دیکھو لکھا ہوا ہے کہ جو لوگ بالکل بے عقل ہوں گے اور کام نہ کریں اور نہ ہی کسی قابل ہوں گے، ان سے کوئی ٹیکس نہیں لیا جائے گا۔ لیکن جو لوگ عقل کے بل پر روزی کمائیں گے اور روٹی کھانے کے بعد ان کے بدن میں تازہ لہو بنے گا وہ پچاس فی صد خون اور گوشت بطور ٹیکس ادا کریں گے۔ اور جو عقل کے بل پر اور بڑے بڑے کام کریں گے ان پر ٹیکس کی شرح نوے فیصد ہوگی۔''

کریم نے دیکھا—— نجے کا پورا بدن کانپ رہا تھا۔ وہ کاغذ اور پنسل وہیں رکھ کر نجے کے پاؤں دابنے لگا۔

دھیرے دھیرے نجے کی آواز اُبھری۔ ''نہیں دیکھا جاتا They are taking the mind and protecting the mindless."

کریم نے گلاس میں پانی انڈیل کر نجے کو پلایا اور پھر آہستہ آہستہ اس کی پیشانی سہلانے لگا۔

اچانک پھر نجے کی چیخ جیسی آواز گونجی۔ ''تلاشی؟ کیسی تلاشی؟''

کریم نے انداز سے ایک سوال داغا۔ ''کیسی تلاشی لے رہے ہیں؟''

کہتے ہیں آج سارے شہر کی تلاشی ہو رہی ہے... سب کے گھروں کو بھی کھنگھالا جائے گا اور جیبوں کو بھی....

''کیوں؟''

''کہتے ہیں کہ کوئی شخص صداقت کو اسمگل کرکے یہاں لے آیا ہے... کہتے ہیں تم سونا اسمگل کرسکتے ہو، ہیرے بھی، شراب بھی، کچھ بھی کرسکتے ہو لیکن صداقت کو نہیں لاسکتے۔ وہ سب

سے خطرناک چیز ہے۔"

"تو اب؟"

"کہتے ہیں اگر کسی نے مال اسباب کے بجائے اسے سینے میں جگہ دی تو وہ چھری سے چاک کر کے وہاں سے بھی برآمد کر لیں گے۔"

"تو اب؟"

"چلو کسی بڑے آدمی سے ملاقات کریں۔ کسی وزیر سے، جو ہمیں ان سے نجات دلا سکے۔"

"چلو۔"

"لیکن کس سے ملیں، ہم تو کسی کو نہیں جانتے، ٹھہرو۔ ان سے پوچھتا ہوں —— کیا؟"

"کیا...؟"

کریم نے دیکھا —— سنجے کی پیشانی پر اوس کے قطرے اُبھر رہے تھے۔ پاس کوئی رومال نہ تھا، اس نے بستر کی چادر کا کنارہ اٹھا کر سنجے کی پیشانی پونچھ دی۔

سنجے کہہ رہا تھا —— سنو! یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ خدا جانے یہاں بھی حکومت کا کام کیسے چلتا ہے۔"

"کیا کہتے ہیں؟"

"کہتے ہیں —— یہاں ایک وزیر صرف سامانِ جنگ کا وزیر ہے جو دوسرے خطوں کو ہر ماہ گولہ بارود فروخت کرتا ہے کہ لوگوں کے پاس یہ سامان ختم نہ ہو جائے... یعنی اگر لوگ لڑ کر مریں گے نہیں تو سبھی خطوں کی آبادی بہت بڑھ جائے گی۔"

"اچھا..."

اور کہتے ہیں —— ایک وزیر، صرف فسادات کا وزیر ہے —— جس کے ذمّے یہ کام ہوتا ہے کہ وہ سال بھر میں کم از کم بارہ مرتبہ فرقہ وارانہ فسادات برپا کرائے... اگر ایسا نہ ہو تو لوگ مذہب کے نام پر مرمٹنے کا سلیقہ ہی بھول جائیں گے۔"

"توبہ..."

"تم نے یہ توبہ توبہ کیا لگا رکھی ہے۔ سنو وہ کیا کہہ رہے ہیں کہ ایک وزیر ہڑتال کرانے کا ذمہ دار ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو پیداوار اتنی بڑھ جائے گی کہ قیمتیں کم کرنی پڑیں گی اور سرکار کو خسارہ

سہنا پڑے گا۔"

"اور کیا کہتے ہیں؟"

"کہتے ہیں —— بولو تم کس وزیر سے ملنا چاہتے ہو؟ یہاں ایک وزیر رشوت خوری کا بھی ہے، جس کی ذمہ داری یہ ہے —— کہ وہ کسی بھی دفتر میں کوئی کام بنا رشوت نہ ہونے دے... اگر ایسا نہ ہو تو لوگ سرکاری اہل کاروں کی قدر و منزلت فراموش کر دیں گے۔"

سنجے جوں جوں بولتا جا رہا تھا، کریم کا سر چکرا رہا تھا۔ اسے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ بات کہاں تک جائے گی۔ اور سنجے کا حواس بحال ہوں گے بھی —— اور یہ دوزخ کی ان بھیانک تفصیلات سے کب نکلے گا۔

"دیکھو! کہہ رہے ہیں کہ ایک اور وزیر ہے، جو لوگوں کی بے عقلی کا ذمہ دار ہے یعنی لوگوں کو صرف سننے کا طریقہ سکھایا جائے۔ سوچنے کی تربیت بالکل نہ دی جائے۔ سوچنے سے کہتے ہیں —— لوگ اطاعت گزار نہیں رہتے۔

سنجے نے بدن میں کھولتے غصے کے طوفان کے زور سے بازو لہرایا اور کریم کا بازو کھینچ کر بولا: "میں اور کچھ نہیں دیکھ سکتا... چلو موت کے فرشتے! تم جس طرح مجھے یہاں لائے تھے، اسی طرح واپس لے چلو۔"

کریم کو پتہ نہیں چل رہا تھا کہ اب وہ ہنسے یا روئے۔ آج کتنے دنوں کے بعد سنجے کے جسم میں حرکت ہوئی تھی۔ لیکن حواس ابھی تک نہ جانے کس جہاں میں تھے۔

سنجے ایک عالم ناپسندیدگی میں کپکپا رہا تھا، کریم جلدی سے اس کے سرہانے سے اٹھ کر پائنتی کی طرف چلا گیا اور ہاتھوں سے اس کے تلوے سہلانے لگا۔

کچھ دیر بعد کریم کو لگا —— جیسے سنجے سو گیا ہو، اس نے اٹھ کر ٹھنڈے پانی کا گلاس پیا اور اپنی چارپائی کی طرف بڑھا ہی تھا کہ سنجے کی آواز آئی۔ "سنو!"

کریم پھر سنجے کے سرہانے آ کھڑا ہوا۔ سنجے کہنے لگا —— تم نے مجھے بتایا تھا کہ موت کے زائچے میں تین جونیں ہوتی ہیں: پہلی مذہبی جون، جب کئی دن تک روح کو بدن نہیں ملتا۔ دوسری جنسی ملاپ کی جون۔ جب وہی ارضی وجود مل جاتا ہے اسی جسم جیسا لیکن وہ گوشت کا نہیں ہوتا۔ صرف صورت ویسی ہی ہوتی ہے۔

کریم کو پتہ نہیں چل رہا تھا کہ اب وہ کیا جواب دے۔ سو وہ جوں کا توں خاموش رہ گیا۔

لیکن بنجے کہہ رہا تھا —— اور تیسری جون اجر میں ملنے والی جون ہوتی ہے۔ پھر سے زمین پر واپس جا کر ملنے والا وجود۔

''ہاں۔'' کریم نے آہستہ سے کہہ دیا۔

''تم نے یہ بھی کہا تھا کہ جو روح اجر میں ملنے والے وجود کے خواہش مند نہیں ہوتے اُنھیں نجات مل جاتی ہے لیکن میں نجات نہیں چاہتا۔ میں واپس اپنی زمین پر جانا چاہتا ہوں۔ تم مجھے خاکی وجود دے دو۔ مجھے زمین پر واپس جا کر دوزخ کا مکمل منظرنامہ قلمبند کرنا ہے۔ ہاتھ میں قلم تھامنے کے لیے میرے ہاتھ بے چین ہو رہے ہیں۔''

کریم سے مزید صبر نہ ہو سکا، اس نے بنجے کو مضبوطی سے دونوں بازوؤں میں لے لیا۔

''آ جاؤ یار! میری زمین پر لوٹ آؤ، دیکھو تمہارا کریم کس طرح تڑپ رہا ہے۔''

اور کریم بنجے کے سر کو سینے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

اُنچاس دن ہو چکے کیا؟ بنجے کی آواز آئی اور ساتھ ہی ''میں... میں کہاں ہوں؟''

بنجے کی آواز حلق میں جنم لے کر حلق ہی میں دم توڑ چکی۔

''میرے پاس، اپنے کریم کے پاس۔''

''یہ مجھے اجر میں ملا ہوا وجود —— حیات بعد موت؟''

''ہاں، ہم کریم میاں...''

''میں بھی یہی چاہتا تھا کہ زمین پر پھر جاؤں اور اپنے کریم کے ہاں جنم لوں...''

''تم میرے یار بھی ہو، میرے بیٹے بھی۔ اور...'' یہ کہتے کہتے کریم پر رقت طاری ہو گئی۔

جانے بنجے کو رات بھر کے بھیانک روپ کی تھکن تھی یا حیات بعد الموت کے وجود کے تصور میں پیدا ہونے والے نازک نازک نئے اعضا کی کمزوری کا احساس کہ وہ کریم کی گود میں سر رکھ کر بڑے سکون سے سو گیا۔

رات کا آخری پہر تھا —— جس وقت کریم نے بنجے کے سر کو آہستہ سے سرہانے پر ٹکایا اور گھڑی بھر کو آنکھ موندنے کی خاطر اپنے بچھونے پر لیٹ گیا —— اور دونوں ہاتھ آسمان کی طرف

بلند کیے اور بولا: ''تیرا شکر ہے خداوندا تیرا شکر ہے۔''

اور کریم کو محسوس ہوا —— جیسے اس کی دونوں ہتھیلیاں ستاروں سے بھر گئی ہوں۔

کریم کی آنکھ کھلی تو اس کی نگاہ بنجے کی چارپائی کی طرف اٹھی —— اور پایوں سے ٹکرا کر فرش پر گر گئی۔

بنجے چارپائی پر نہیں تھا۔

کریم کے اپنے ہاتھ پاؤں جیسے زمین پر رہ گئے تھے اور اس کی روح خالی آسمانوں میں ڈول رہی تھی۔

آنگن کا بیرونی دروازہ چوپٹ کھلا تھا۔

کریم دروازے کی طرف دوڑا سامنے خالی گلی نظر آ رہی تھی، گلی میں دوڑ کر گزرتا وہ مین روڈ پر آیا۔ راستے کی دھول بھی ابھی نیند سے بیدار نظر نہیں آئی تھی۔

داہنی جانب اور گلیاں تھی اور بائیں جانب ایک ویران راستہ تھا جو گھروں سے عقب میں کھنڈروں کو جاتا تھا۔ کریم نے اس طرف پاؤں ڈال دیے۔ یقین تو نہیں آ رہا تھا کہ چھتیس گھنٹے قبل بنجے جن پیروں کو اپنے پیر تسلیم نہیں کر رہا تھا، ان ہی قدموں سے وہ چل کر ادھر گیا ہوگا۔ لیکن نگاہوں کو تلاش کا کوئی امکان نظر بھی نہیں آ رہا تھا۔

کریم کو ایک جھلک سی نظر آئی —— جیسے اونچے نیچے پتھروں کے درمیان کوئی انسانی ہیولی سا ہو لیکن وہ بالکل ساکت تھا، کسی بت کی طرح، کریم ان کھنڈروں کے ایک ایک پتھر کا شناسا تھا، وہ جانتا تھا کہ وہاں کوئی مکمل یا شکستہ مورتی نہیں ہے۔ پھر بھی اس نے پلکیں جھپکا لیں کہ شاید نظر کا دھوکا ہو۔

ذرا اور آگے بڑھا —— تو پاؤں سے الجھے تہمد کے پلو سے ٹھوکر کا سا احساس ہوا، پاؤں تو سنبھل گیا لیکن جھٹکے سے ایک چھوٹا سا سنگریزہ لڑھک کر ماحول کی خاموشی کو توڑ گیا تو کریم نے اس بت کو ہلتے دیکھا...

کریم کے پاؤں کو پر لگ گئے۔ قریب پہنچا تو بنجے نے چپ چاپ اپنا سر کریم کے سینے سے لگا دیا۔

کریم سے بولا نہیں گیا۔

نجے نے ہی کہا: "یقین نہیں آتا کریم میاں کہ ہم ایک ہی دنیا میں ہیں۔"

"اس زمین پر تو تمھیں بمشکل موڑ کر واپس لائے ہیں۔" کریم نے کہا اور آنکھوں میں امڈا پانی انگلیوں کی پوروں سے چن دیا۔

"اب بھی پتہ نہیں چل رہا —— کہ سچ کیا ہے اور خواب کیا..."

نجے نے کریم کے منہ کی طرف دیکھتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے جیسے اسے پھر ٹٹول کر دیکھا اور پوچھا —— "ابھی میں جہاں سے اٹھ کر آیا ہوں —— وہ تمہارا گھر تھا؟"

"ہاں، بخار کے عالم میں تم پر بے ہوشی طاری تھی۔ اس لیے میں تمھیں تمہارے کمرے سے گھر لے آیا تھا۔" کریم نے بتایا۔

"وہاں میں نے تمھیں چارپائی پر پڑے دیکھا تھا۔ تمھیں ہاتھوں سے چھو کے بھی دیکھا لیکن پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کہاں ہوں۔"

"مجھے جگایا کیوں نہیں؟"

"خود مجھے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ سو رہا تھا یا جاگ رہا تھا۔ یہی دیکھ رہا تھا کہ یہ کون سی جگہ ہے... تمھیں کچھ پتہ نہیں تھا کہ تم کہاں تھے... مجھے بھی پتہ نہیں تھا۔"

"تمھیں کچھ یاد آتا ہے؟"

"یاد تو آتا ہے مگر یقین آیا... عجیب خواب تھا، بالکل سچ لگتا تھا... چلو گھر چلیں۔"

"اگر گھر کے لوگ جاگ گئے ہوں گے تو پریشان ہوں گے۔"

نجے چلنے لگا لیکن پھر پل بھر کے لیے رُک گیا۔ کہنے لگا: "کریم میاں! تم نہیں جانتے میں کہاں گیا تھا... سچ مچ وہاں گیا تھا جہاں سے کوئی کبھی لوٹ کر نہیں آیا۔"

"وہ میں جانتا ہوں، لیکن تمھیں خدا کی قسم اب لوٹ کے نہ جانا۔"

نجے ہنس سا دیا —— "ایک دن تو سچ مچ جانا ہوگا —— میں نے اور سبھی نے..."

لیکن نجے کچھ حیران ہو کر پوچھنے لگا: "لیکن یار! تمھیں کیسے معلوم ہے کہ میں کیسے گیا تھا؟"

"مجھے معلوم ہے لیکن کیا تمھیں واقعی یاد ہے کہ تم کہاں گئے تھے؟"

"ہاں —— جسے ہم یہ دنیا نہیں دوسری دنیا کہتے ہیں... یہ ضرور بخار کے سر کو چڑھ جانے

کی صورت میں آیا ہوگا لیکن بہت بھیانک تھا..."

"اگر میں تمھیں سب کچھ سنا دوں تو تم کانپ اٹھو گے۔"

"اچھا۔" کریم کچھ کہنا چاہ رہا تھا پھر رُک گیا اور پوچھنے لگا: "تم خواب کے عالم میں اُنچاس دنوں کا ذکر کرتے تھے، تمھیں یاد ہے؟"

"کریم میاں! صدیوں سے ایک سوچ چلی آئی ہے کہ مرنے کے بعد انسان کی روح کو دوبارہ آنے سے پہلے اُنچاس دن تک آسمانوں میں قیام کرنا پڑتا ہے۔"

کریم ہنس دیا۔ کہنے لگا: "یار پھر تو اچھا ہے کہ تم نے چار پانچ دن کے اندر ہی اُنچاس دن کا سفر طے کر لیا ہے۔ اگر کہیں سچ مچ کے انچاس دن اس طرح کاٹنے پڑتے ہیں تو پھر میں بھی تمھیں لینے کے لیے تمہارے پیچھے پیچھے ہی آسمانوں پر چلا جاتا... اب تک میں اسی دنیا میں کھڑا ہو کر ہی تمھیں آوازیں دیتا رہا ہوں۔"

اب کریم کی نہیں نجے کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ اسے بچانے کے لیے کریم نے کیا کیا جتن کیے ہوں گے۔ نجے نے قیاس کیا اور اس کا من کریم کے آگے جھک گیا۔

"تو تم اُٹھ کر ان کھنڈروں میں کیوں چلے آئے۔"

"کسی جگہ کو شناخت نہیں کر پا رہا تھا، ایک دروازہ سا نظر آیا۔ کھول کے دیکھا، باہر ایک گلی سی نظر آئی۔ ذرا اور آگے بڑھا... اگر ہے تو ابھی آباد ہے یا کھنڈر ہو چکی ہے؟"

کریم نے نجے کو دونوں بازوؤں کی گرفت میں لے لیا۔ "اور کسی کے بارے میں تو علم نہیں لیکن اگر تمھیں ہوش نہ آتا تو میرے لیے یہ دنیا کھنڈر ہو ہی چکی تھی؟" کریم اور نجے واپس مڑے گلی کے موڑ تک آئے تو نجے کہنے لگا —— تمھیں آرام سے بیٹھ کر سناؤں گا —— میں نے آسمانوں کے خواب میں کیا کیا دیکھا ہے... لیکن ایک بات ابھی بتانا چاہتا ہوں۔ وہاں موت کے فرشتے نے مجھے ایک عجیب سا آئینہ دکھایا تھا۔ اگر تم چاہو تو تمھیں پچھلے جنم کا سارا حال اس میں سے نظر آ جاتا اور میں نے آئینے میں سب سے پہلے تمھیں دیکھا تھا۔"

"دیکھ لو، میں نے سچ مچ دوستی کا حق فائق ثابت کیا ہے۔ اسی لیے تو مر کے بھی بیتا کی طرح میں تمہارے خوابوں میں رہا۔"

نجے نے بیچ سے بات کاٹی۔ "تمھیں کیسے معلوم ہے کہ وہاں میں نے کئی بار بیتا کو بھی

دیکھا تھا؟"

"تمہارے ہی منہ سے سنا تھا——— تم خواب میں بڑبڑاتے جو تھے۔"

"اور بھی کچھ کہا تھا۔"

"بہت کچھ..."

"کیا، کیا؟"

بیٹھ کر باتیں کریں گے... جانے اب کتنے دن تک یہی باتیں ہوں گی۔"

کریم نے گھر کے آنگن میں داخل ہوتے وقت ایک عجیب فریادی سی کیفیت کا احساس کیا۔ اس نے جلدی سے سب کو تسلی دی اور کہنے لگا: "لو برکت اور نعمت! آج جو شیرینی تقسیم کرنی ہے کرلو۔ میرا دوست تندرست ہوگیا ہے۔"

اور کریم نے مڑ کر ننھے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "یہ میری دونوں بیٹیاں اور یہ چار چھوٹے بڑے ان کے بچے۔"

ننھے نے دونوں کو ہاتھ اٹھا کر سلام کیا اور پھر شیریں اور جمیلہ کی طرف دیکھتا ہوا کہنے لگا۔

"کریم میاں! یہ اب بچے نہیں رہے خاصے سیانے ہوگئے ہیں۔"

کریم نے ہنس کر شیریں کی طرف دیکھا اور کہا: "یہ بڑی پگلی پرسوں رات مجھ سے بھی چوری کمرے میں بیٹھ کر خدا سے تمہارے لیے دُعا مانگ رہی تھی۔"

شیریں نے شرما کر اپنا سرخ دوپٹہ دانتوں تلے دبا لیا اور اندر کی طرف جاتی ہوئی بولی: "ابا، تمہارے لیے چائے بناؤں۔"

سبھی چائے پی رہے تھے۔ جب ڈاکٹر آیا۔ کریم نے جلدی سے چارپائی سے اٹھ کر ڈاکٹر کا بیگ تھام لیا اور کہنے لگا: "ڈاکٹر صاحب آج تو مجھے ہی جلدی سے انجکشن لگا دیجیے، ورنہ میں خوشی سے پاگل ہو جاؤں گا۔"

ڈاکٹر نے اُدھر دیکھا۔ جہاں ننھے چارپائی پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ اس وقت آنگن میں قدرے دھوپ آگئی تھی لیکن جس گوشے میں نیم کا سایہ تھا وہاں کریم نے دو چارپائیاں بچھا رکھی تھیں۔

ننھے نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا اور قیاس کیا کہ وہ اسی کا علاج کر رہا تھا۔ اس لیے اس نے

چائے کا خالی پیالہ چارپائی کے پائے کے پاس رکھا اور اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

"مبارک ہو ننھے صاحب! اُس جہاں سے واپس زمین پر ہمارے پاس لوٹ آنے کی۔"

ڈاکٹر نے یہ کہتے ہوئے ننھے سے ہاتھ ملایا۔

"لگتا ہے بے ہوشی میں بہت کچھ بولتا رہا ہوں۔ اسی لیے آپ جہانِ دگر کی بات کر رہے ہیں۔" ننھے ہنس دیا۔

"وہاں آپ نے کون کون سے رنگ دیکھے۔ نیلے، لال، پیلے، ایک دن بیٹھ کر باتیں کریں گے لیکن اس وقت ذرا بازو ادھر کیجیے آج کا انجکشن لگا دوں۔ خواہ کل آپ خود ہی میرے کلینک آکر لگوا لیجیے گا۔ دو دن مزید لگ جائیں تو اچھا ہے۔"

ڈاکٹر نے کہا تو کریم نے ہنس کر بازو آگے کر دیا: "اب مریض بدل لیجیے اور اسے کہیے کہ یہ دو چار دن اب میری خدمت کرے۔"

"تم میں میاں! بڑی جان ہے، دوائیاں تو اپنی جگہ مگر اصل میں اس کی زندگی تم نے بچائی ہے..." ڈاکٹر نے کریم سے کہا اور ننھے کو انجکشن لگا دیا۔ دوا بھی بدل دی اور طاقت کے لیے نئی دوا بھی تجویز کر دی۔

زندگی تو میری سچ مچ ڈاکٹر صاحب! میرے دوست نے واپس دلائی ہے۔" ننھے کہہ رہا تھا جب کریم نے بات کاٹ دی۔

"نہیں جی، میری اوقات کہاں کہ میں اسے واپس زمین پر لاتا، یہ تو بھلا ہو اس کے قلم کا جو اس جہاں میں ضد پر اڑ گیا کہ یہاں لکھنا ممکن نہیں۔ یہ تو دوزخ کا حال قلمبند کرنے کے لیے بے چین ہو رہا تھا——— اس لیے تو زمین کی طرف واپس آنے پر تیار ہوا... کہ یہاں اور کچھ نہیں کم از کم لکھا تو جا سکتا ہے۔"

ننھے کو صحت یاب ہوئے پورے دو دن ہوگئے تو تیسرے دن صبح کو بیدار ہوتے ہی وہ کریم سے کہنے لگا: "یار آج میرے ہاتھوں میں کھجلی ہو رہی ہے۔"

کریم نے ہنس کر اونچی آواز میں کہا: "اے لڑکیو! شیریں اور جمیلہ! کہاں ہو جلدی سے ایک بوری لاؤ۔"

ننھے کریم کے منہ کو تکنے لگا مگر کریم اسی رو میں لڑکیوں سے مخاطب ہوتا کہنے لگا: "اگر

ہاتھوں میں کھجلی ہو تو بہت سا پیسہ آتا ہے۔ سولڑ کیو! بوری تیار رکھو روپیوں سے بھرنے کے لیے۔ آج میرے یار کے ہاتھوں میں خارش ہو رہی ہے۔''

نجے ہنس دیا۔ وہ ہاتھ اور ہوا کرتے ہوئے یار! جنھیں روپے پیسے کی خارش ہوتی ہے۔ میں سوچتا ہوں بہت دن ہو گئے ہیں مہمان نوازی کرواتے، اب اپنے کمرے میں جا کر کوئی کام کروں...''

کریم نے اپنے دونوں ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ ''خارش تو سچ مچ میرے ہاتھوں کو بھی ہو رہی ہے کم بخت بھی جب تک مشین نہ گھمائیں انھیں بے چینی سی لگی رہتی ہے۔''

''تم نے پریس سے چھٹی لے رکھی ہے؟'' نجے نے پوچھا۔

''وہ تو لینی ہی تھی لیکن چار دن کی زیادہ لے لی۔ کیا دن ہے آج؟''

''منگل۔''

''سوموار، منگل، بدھ، جمعرات، جمعہ، ہفتہ اور اتوار ابھی چھ دن باقی ہیں۔ کریم نے انگلیوں پر دن گنتے ہوئے کہا۔ حساب کے مطابق تو مجھے پیر کے روز کام پر جانا ہوگا۔''

''تنخواہ کٹوا کر چھٹی لی ہے یا؟''

''یوں تو میری چھٹی بنتی تھی لیکن مالک چھٹی دینے پر تیار نہیں تھا—— چھٹی تو بہر حال چاہیے آپ تنخواہ دیں نہ دیں، یہ آپ کی مرضی، میں نے کہا تھا، سو اس نے گول مول انداز میں ہاں کر دی تھی۔ لیکن وہ تو کوئی بات نہیں۔ اگر تنخواہ کاٹ بھی لے تو بھی کیا ہے۔ چھٹی کام تو آ گئی۔''

کریم کہہ رہا تھا جس وقت نجے یہ سوچ رہا تھا کہ جانے اس نے کس طرح ڈاکٹروں کی فیس اور دوائیوں کے پیسے ادا کیے ہوں گے۔ کون جانے اُدھار لیا ہوگا یا گھر کا کوئی زیور بیچا ہوگا۔ چنانچہ چائے کا آخری گھونٹ تیزی سے حلق میں انڈیلتا کہنے لگا۔ چلو پھر کاموں پر چلیں۔ تم باقی ماندہ چھٹی کٹوا کر اپنا کام شروع کر دو اور میں پریس جا کر دیکھتا ہوں شاید پروف ریڈنگ کا کوئی کام آج ہی مل جائے۔''

''اچھا تو میں بھی چلتا ہوں، مالک تو شکر کرے گا کہ میں پریس واپس آ گیا ہوں اور اگر کوئی پروفوں کا کام ہوگا تو میں لیتا آؤں گا۔ ابھی میں تمھیں بسوں اور سائیکلوں پر زحمت نہیں اٹھانے دوں گا۔''

کریم نے حکم کی طرح نجے سے کہا اور باورچی خانے کی طرف منہ کر کے کہنے لگا: ''نیک بیبو! دو روٹیاں اتار کر ڈال دو اور پھر اپنے بڑے بیٹے کو آواز دے کر کہنے لگا: ''عبداللہ! دیکھو بیٹے میری سائیکل میں ہوا تو موجود ہے نا؟''

کریم ایک پریس میں مشین مین تھا اور چھٹی پر تھا، آج کسی کو بھی اس کے آنے کی امید نہیں تھی لیکن جب وہ پریس پہنچا تو پریس کا مالک اسے یوں دیکھنے لگا جیسے وہ کسی مشکل گھڑی میں چھت پھاڑ کر آن اُترا ہو۔''

آؤ بھئی کریم میاں! مالک کرسی سے اٹھتا بڑے تپاک سے بولا لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی آواز سمٹ کر ٹھنڈی پڑ گئی۔ خیال آیا کہ ان کارکنوں کو مالک کی محتاجی کا زیادہ احساس نہیں ہونا چاہیے ورنہ یہ اور بھی پھول جائیں گے۔ سو کہنے لگا آپ لوگ چھٹیاں لے کر گھر بیٹھ جاتے ہو۔ چھٹیوں کی تنخواہ جو مفت ملتی ہے، یہ نہیں سوچتے کہ ہم نے وقت پر کام دینا ہوتا ہے۔

اس کے دل میں اس شبہے نے بھی جنم لیا کہ کریم شاید مزید چھٹی کی درخواست دینے آیا ہے، اس لیے اس کی آواز اور بھی سخت ہو گئی اور وہ کہنے لگا: ''وہ تم اپنی جگہ جو کرائے کا ٹٹو دے گئے تھے۔ اس سے یہ تو پوچھ لیتا تھا کہ اس نے پہلے کبھی سلینڈر مشین کا نام بھی سنا تھا کہ نہیں؟''

کریم ہنس دیا—— نہیں جی وہ میں نے کب دیا تھا، وہ تو آپ ہی نے کہا تھا کہ چار دن کام چلا لے گا، وہ پہلے بھی آپ کے پاس مشین مین تھا۔''

''ہوا کرتا تھا بھئی، لیکن اس وقت ہمارے پاس یہ سلینڈر مشینیں کب تھیں تم نے ہی تو کہا تھا کہ میں نے اسے کام سمجھا دیا ہے۔''

جیسے آپ نے فرمایا تھا پورا دن لگا کر میں نے سمجھا دیا تھا تو کیا بھاڑے کے ٹٹو نے مشین کو دولتی جھاڑ دی ہے؟'' کریم کی ہنسی چھوٹ گئی۔

مالک نے اور بھی منہ بنا لیا۔ کریم کا یوں ہنسنا اسے اچھا نہیں لگا تھا۔ جلدی سے کہنے لگا: ''اب تمھیں مزید چھٹی نہیں مل سکتی۔''

''میں کب چھٹی لینے آیا ہوں جناب، بلکہ میں تو چھٹی کٹوانے آیا ہوں۔ آنا تو مجھے اتوار کے بعد پیر کو تھا لیکن میں نے سوچا کہ جس کام کے لیے چھٹی لی تھی وہ تو ہو گیا، اب گھر میں بے کار بیٹھ کر کیا کروں گا۔''

مالک کی آواز میں پھر کچھ تپاک شامل ہو گیا، کہنے لگا: ''بہت اچھی بات ہے۔ آج بہت ضروری کام دینا ہے، جلدی سے نکال دو۔''

کریم نے مالک کے دفتر والے کمرے سے نکل کر باہر چوبی چھپروں کے نیچے کام کرتے ہوئے سارے کمپوزیٹروں سے رام سلام کہا اور مشین والے کمرے کے کونے میں جا کر کام والے کپڑے پہننے لگا۔

اس کمرے میں دو کمپوزیٹر فرمے باندھ کر مشین کے پاس رکھ رہے تھے۔ کریم کو وہ دونوں جانے پہچانے نہیں لگے، ہنس کے کہنے لگا: ''یہاں تو کام میں برکت کا ثبوت مل رہا ہے، کیوں بھائی نئے آئے ہو، کیا نام ہیں تمہارے؟''

کریم نے فرما مشین پر چڑھاتے ہوئے کہا: ''بھائی کام مل گیا اور کیا چاہیے نوکری کا معاوضہ کوئی شیشے کے فریم میں تھوڑی جڑایا جاتا ہے۔''

دونوں بنّا اور سنتا کریم کے پاس کھڑے ہو گئے اور بیرونی چھپروں کی طرف ہاتھ کر کے کہنے لگے: ''وہ دیکھو ملازمت پیشہ لوگ دن بھر میں چار صفحے نہیں جوڑ پائے، ہم تو پوریں توڑ کر کام کرتے ہیں، ٹھیکے پر جو کرنا ہوا۔''

''ہاں، ہاں۔'' کریم نے مشین پر کاغذ چڑھاتے ہوئے کہا۔ جتنا گڑ ڈالو، اُتنا میٹھا ہوگا۔ جتنے صفحے تیار کرو گے۔ رقم بھی تو اتنی لو گے۔''

بنّا جلدی سے بولا: ''یہ تم بھول رہے ہو میاں کہ ہمیں کوئی اس وقت پوچھتا ہے جب کام رکا ہوا ہو، آگے پیچھے تو ملازمت پیشہ ہی داماد ہوتے ہیں۔ کام ہو یا نہ ہو۔ پہلی تاریخ کو بندھی ٹکی تنخواہ گھر لے جاتے ہیں۔''

کریم مشین پر کاغذ چڑھا کر مالک سے آرڈر کی تعداد پوچھنے جا رہا تھا کہ بنتے کی بات سن کر رُک گیا۔ کہنے لگا: ''دوست تم بھی یہ بھول گئے ہو کہ نوکریوں والے تو داماد ہوتے ہیں لیکن کام کرنے والے سگے بیٹے ہوتے ہیں۔''

دوپہر کو نصف گھنٹے کے وقفے کے وقت جب بھی کارکنوں نے اپنے اپنے لنچ کے ڈبے کھول کر بنچوں پر رکھ لیے تو کریم بھی ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتا اپنے پرانے دوستوں، ساتھیوں سے کہنے لگا: ''ساتھیو! آج کل ہاتھ کیوں ڈھیلے کر رکھے ہیں کام کیوں نہیں نکال رہے؟''

ایک کمپوزیٹر ہنس دیا۔ کہنے لگا: ''میاں! زمانے کی رفتار کے ساتھ چلنا پڑتا ہے۔ ہم تمہاری طرح عہد صداقت کے آدمی نہیں ہیں...''

''اچھا بیٹا! کریم نے منہ کے نوالے کو چباتے اپنی آواز بھی چبالی پھر بھی اس عہد گمری کا راز بتا دو۔''

ایک اور کمپوزیٹر زور زور سے ہنسنے لگا اور کہنے لگا: ''جو کچھ سرکاری دفتروں میں ہوتا ہے، وہ طریقہ ہم نے بھی سیکھ لیا ہے، وہ طریقہ ہے: "Go Slow."

''آہستہ خرام۔''

''وہ کیا ہوتا ہے بھئی۔''

''کہ کام کو آگے چلنے ہی نہ دو...''

''سمجھ گیا۔'' کریم ہنسنے لگا تو ایک کمپوزیٹر بولا: ''لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آئے گی چاچا۔''

کریم نے ایک شانِ بزرگی سے سر ہلایا کہنے لگا—— ''ہاں بھتیجو! میں یہ سمجھ نہیں سکتا کہ آدمی کے آگے بند باندھے اور اس کی جگہ اپنی زبان کو کھلی چھٹی دے دے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ ہم اپنے مطالبات کا اظہار نہ کریں؟'' دو کمپوزیٹر کریم سے غصے کا اظہار کرنے لگے۔

کریم اسی خنک اور پرسکون لہجے میں کہنے لگا: ''اگر مجھے چاچا کہا ہے تو چاچا کی بات بھی سن لو، میں نے کب کہا ہے تم اپنے جائز مطالبات کا اظہار بھی نہ کرو۔''

''تم یہی تو کہہ رہے...''

''نہیں میں یہ نہیں کہہ رہا۔ میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ زبان چلانے کا حق صرف اُسی کو حاصل ہے جو ہاتھوں کو بھی چلائے۔ کام پورا کرو اور پوری اُجرت مانگو۔''

''لیکن چاچا! خاموش رہنے پر کوئی اُجرت دیتا ہے؟''

''نہیں دیتا تو کام چھوڑ دو۔''

''لو سنو اس کی باتیں—— اچھے بھلے روزگار کو لات ماردیں اور بے کار ہو کر گھر بیٹھ رہیں۔ یہی تو فائدہ ہوتا ہے نوکری کا کہ ایک تو کھاؤ اور ساتھ ہی گھورو کیونکہ نوکری سے تو کوئی نکال

نہیں سکتا نا۔'' ایک کمپوزیٹر نے جب یہ کہا تو باقی سب نے اس کی طرف یوں دیکھا جیسے اس کی انتہائی دانش مندانہ دلیل پر داد دے رہے ہوں۔ ایک اور نے حامی بھری۔ اسی لیے تو یونین ہوتی ہے اور اس کے لیے ہوتی ہے اور باقیوں کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھتا ہوا بولا: ''کیوں حضرات! میں نے ٹھیک کہا ہے یا نہیں؟''

کریم نے سب کے سر پر چموں کی طرح ہلتے دیکھے اور اپنے روٹی کے خالی ڈبے کو بند کرتا ہوا بولا: ''جس نے بھی یونین کا تصور بنایا، کوئی بہت بہت ہی دانش مند انسان ہوگا۔ اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ تم لوگ نعرے لگا کر نوکریاں تو قائم رکھو گے لیکن تمہاری ہڈیوں میں پانی پڑ جائے گی مجھے ایک بات بتاؤ۔''

''کیا؟'' سبھی نے کچھ برہمی سے پوچھا۔

''یہ کہ آج تک جو بھی ہڑتالیں ہوتی رہی ہیں اس کے دوران یہ تو سبھی یہ آواز بلند کرتے رہے ہیں کہ مہنگائی بڑھ گئی ہے اس لیے تنخواہیں بھی بڑھائی جائیں لیکن کبھی ہڑتالیوں نے یہ بھی کہا ہے ـــــ کہ ہم آئندہ اپنی استعداد کا اضافہ کریں گے اس لیے ہماری اجرتوں میں اضافہ کیا جائے؟ مجھے بتاؤ کبھی کسی نے یہ کہا؟''

کریم کا لہجہ بات کرتے کرتے سنجیدہ ہوگیا۔ تو سارے کارکن ہنس دیے۔ ایک نے کہا کریم چاچا! سرکاری نوکر تو سرکار کے داماد ہوتے ہیں۔ ہر کرسی سرکار کی بیٹی ہوتی ہے اور کرسی پر بیٹھنے والا سرکار کا داماد۔''

کریم نے اسی کے انداز میں سانس کھینچی اور بولا: ''میں بھی یہی کہتا ہوں کہ آپ اپنے وطن کے بیٹے بنیں تمھیں وطن کے دکھ درد کا احساس ہو۔ دامادوں کو بھلا درد کا احساس کیسے ہو سکتا ہے؟''

اور کریم کے سانس کی رفتار میں اور بھی سنجیدگی آگئی۔ وہ کہنے لگا: ''لیکن آپ سے کیا کہوں ـــــ وطن کے سب سے بڑے داماد تو وزرائے کرام ہوتے ہیں۔

سارے کمپوزیٹر ہنس پڑے۔ ایک کہنے لگا کہ ''کریم چاچا! کہاں گئے تھے چھٹیاں لے کر؟ بہت ہوشیاری کی باتیں سیکھ آئے ہیں۔''

''خدا کی قسم تم جس قسم کی باتیں کرتے ہو اگر انتخابات میں کھڑے ہو جاؤ تو سبھی لوگ

تمھیں ہی ووٹ دیں۔''

کھانے کے وقفے کا نصف گھنٹہ بیت گیا تھا۔ سبھی کے کانوں سے گھنٹی کی آواز ٹکرائی تو سبھی ایک دوسرے کی طرف دیکھتے، ہنستے ہوئے اپنی اپنی جگہ جا کر کام پر کھڑے ہوئے۔

باقی کا نصف دن، چلتی ہوئی مشین کے سرد گرم میں اسیر چپ چاپ گزر گیا۔ ابھی چھٹی کا وقت نہیں ہوا تھا کہ ایک زوردار آواز نے یہ چپ توڑ دی۔

سبھی لوگ کریم کے مشین والے کمرے کی طرف دوڑ پڑے۔ کریم نے بنتے اور سنتے کے روٹیوں والے ڈبے ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھے اور مشین سے اونچی آواز میں گرج رہا تھا ـــــ ''سالو! آج گھر جا کر بال بچوں کو روٹی کی جگہ سکہ کھلانا ہے؟''

سبھی سمجھ گئے کہ بنتے اور سنتے نے تھوڑا تھوڑا ٹائپ چرا کر اپنے ڈبوں میں ڈالا ہوا ہے لیکن یہ کوئی نئی اور اچنبھے والی بات نہیں تھی۔ اس لیے سبھی ہنس پڑے۔ ایک نے جلدی سے مالک کے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ گو اس نے نصف گھنٹہ پہلے مالک کو پریس سے باہر جاتے دیکھا تھا۔ لیکن پھر بھی کمرے میں جھانکا اور مطمئن ہو کر واپس آیا۔ اور کریم کا بازو پکڑتا ہوا کہنے لگا: ''چھوڑو میاں! تم نے کیا لینا ہے اس بات سے تم کیوں خواہ مخواہ اپنے دشمن بنا رہے ہو لوگوں کو؟''

کریم کی طبیعت سے سبھی واقف تھے۔ اس لیے ایک اور آدمی آگے بڑھ کر کریم سے کہنے لگا: ''چھوڑو بھئی، جو کرے گا سو بھرے گا تمھیں کیا؟''

بنتے اور سنتے نے جو کمپوزیٹروں کی طرف سے بات ٹھنڈی پڑتی دیکھی تو ذرا جھک کر کریم کے سامنے آ کھڑے ہوئے اور اور بولے: ''حمایت کرنی ہو تو اپنے جیسوں کی کرو۔ جیسے تم مزدور ہو ویسے ہم مزدور۔ اس وقت مالک تو سر پر نہیں، تم خواہ مخواہ اس کے سرکاری وکیل بن کر کھڑے ہو گئے ہو۔''

سرکاری وکیل کی بات سب کو ہنسا گئی۔ سبھی نے باری باری تائید کی: ''ہاں کریم میاں! جو مزدور کی حمایت کرے وہ تو سچا وکیل ہوا، تم کیوں رضا کارانہ طور پر سرکاری وکیل بنے بیٹھے ہو؟ تم نے مالک سے کیا لینا ہے؟''

کریم کی آواز غم و غصے میں ڈوبی ہوئی تھی، وہ کہنے لگا: ''ہاں میں سرکاری وکیل ہوں۔ میری سرکار ایک ہی ہے ایمان داری۔ صرف میری ہی نہیں ہر مزدور کی۔ یہ تمھیں کس نے کہا ہے

کہ تم مزدور ہو؟ مزدور کا کام مزدوری ہے چوری نہیں۔"

کریم کی ساری بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ پیچھے کھڑے کمپوزیٹروں نے دیکھا کہ مالک سر پر آپہنچا ہے۔ انھوں نے پاؤں کے لمس سے آگے والوں کو چھو کر چپ رہنے کے لیے کہا۔ اور اگلوں نے جب اشارہ سمجھنے کی لیے پیچھے دیکھا تو سب کی نظر مالک پر پڑی اور وہ منتشر ہو گئے۔ ساتھ ہی ان کی ہمدردی بٹنے اور سنتے سے ہٹ گئی۔ آخر یہ معاملہ بھی تو ان میں سے کسی کا نہیں تھا۔ وہ تو نوکری پیشہ تھے، انھوں نے اس بات پر جی ہی جی میں شکریہ ادا کیا اور ان میں سے ایک مالک کو سنا کر اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا—— اور رکھو باہر کے آدمی، ہمیں تو پریس سے ہمدردی ہے۔ لیکن باہر والوں کو کس بات کا احساس... وہ تو چار دن لگا کر دو گنے پیسے بھی لیتے ہیں اور اندر کی جیبیں علاحدہ بھر لیتے ہیں۔"

مالک نے آگے بڑھ کر ہاتھ میں تھامے ہوئے دونوں ڈبے دیکھے بات کو سمجھا اور اشارے سے بٹنے اور سنتے دونوں کو اپنے کمرے میں بلایا۔

کریم خاموشی سے چوبچے پر جا کر صابن سے ہاتھ دھونے لگا۔ چھ بجنے والے تھے۔ چھٹی کا وقت تھا۔ باقی کے تمام کمپوزیٹر کے گرد اکٹھے ہونے لگے۔ ان میں سے ایک مالک کے کمرے سے آتا ہوا بولا: "لو اور سنو! وہ دونوں ہمارا نام لگا رہے ہیں کہ ہم نے انھیں بدنام کرنے کے لیے سکے ان کے ڈبوں میں ڈال دیا تھا۔"

کمپوزیٹر غصّے سے کپکپا اٹھے۔ تو کریم آہستہ سے ہنس کر کہنے لگا: "لو بھئی جیسے تم مزدور ویسے وہ مزدور، اب تم میں سے کون سچا وکیل بنے گا میں تو ٹھہرا سرکاری وکیل۔"

"آج تو الٹی آنتیں گلے کو پڑی ہیں کریم چاچا۔" ایک اور نے کہا اور خجالت سے سب ہنس پڑے۔

شیریں گلی سے باہر جانے والے راستے پر کھڑے ایک پیڑ کے نیچے تنہا اور درماندہ کھڑی تھی کہ اچانک دور سے اپنا باپ سائیکل پر آتا دکھائی دیا۔

اسے یوں لگا—— جیسے باپ کو آتے دیکھ کر اس کی درماندگی اور بھی بڑھ گئی ہو اور وہ خود کو درخت کے پیچھے چھپانے کی کوشش کرنے لگی۔

کریم کی سائیکل ابھی اس درخت سے دور تھی کہ شریں نے دیکھا۔ سائیکل ذرا فاصلے پر رُک گئی اور اس کا باپ سائیکل کو موڑ کر لوٹنے لگا ہے۔"

"شیریں نے آگے بڑھ کر آواز دی—— ابّا!"

وہ باپ کو آتے دیکھ کر گھبرا گئی تھی لیکن واپس مڑتے دیکھ کر اور بھی پریشان ہو گئی—— آواز اس کے منہ سے از خود چھلک پڑتی تھی۔ لیکن کریم بہت دور تھا۔ یہ بھی محسوس ہوا کہ آواز اس تک نہیں پہنچی، لیکن پھر یہ بھی نظر آیا کہ اس کے باپ نے سائیکل واپس گھر کی طرف موڑ لی ہے۔

کریم جب درخت کے قریب پہنچا تو اس نے شیریں کو دیکھ کر بریک لگا دی اور قریب آ کر سائیکل سے اترتا ہوا پوچھنے لگا—— کیوں خیر تو ہے، یہاں کھڑی ہو؟"

شیریں نے جواب دینے کے بجائے پوچھا۔ "ابّا! آپ واپس کیوں لوٹنے لگے تھے؟"

کریم نے کہا—— میں ایک بات بھول گیا تھا، دن بھر یاد نہیں آئی۔ پریس سے پروف لانے تھے لیکن بھول گیا، اب گھر کے پاس آ کر یاد آیا، پہلے سوچا کہ لوٹ کر لے آؤں۔ پھر خیال آیا کہ اب تک پریس بند ہو چکا ہوگا۔ تو خیر کوئی بات نہیں کل سہی۔ لیکن تم یہاں کیوں کھڑی ہوں؟"

"ابّا..." شیریں نے کہا اور ایک بار پھر سڑک کی طرف دیکھا۔

"بتاتی کیوں نہیں؟"

"ابّا... ماں بھی ڈر رہی ہے، میں بھی، آپ ہم سے ناراض ہو جاؤ گے۔ لیکن ہمارا اس میں کوئی قصور نہیں۔" شیریں نے خوف زدہ لہجے میں کہا اور پھر ایک بار بڑی عجلت میں سڑک کی طرف دیکھا۔

"مجھے یہ پہیلیاں اچھی نہیں لگتیں، جو کچھ بھی ہوا ہے، صاف صاف بتا کیوں نہیں دیتیں؟" کریم نے برہمی سے پوچھا تو شیریں کی آواز بھرّا گئی۔ وہ... وہ... نہ جانے کہاں چلا گیا ہے؟"

"کون منّجے؟"

لڑکی نے ہاں میں گردن ہلائی اور کہا: "ماں نے بہت روکا تھا، کہہ رہا تھا کہ ابھی آ جاؤں گا، آپ کے آنے سے پہلے لیکن ابھی تک نہیں آیا۔"

"ہوں۔" کریم نے سائیکل درخت سے لگا دی اور پیچھے سڑک کی طرف دیکھتا پوچھنے

لگا—— کتنی دیر ہوئی اسے گئے ہوئے؟''

''کتنے ہی گھنٹے ہو گئے ہیں... اس وقت دو پہر تھی... میں اسی لیے یہاں کھڑی ہوں، ماں نے کہا تھا کہ موڑ پر جا کر دیکھو شیریں نے جلدی جلدی کہا اور پھر رک کر کہنے لگی ماں بھی ہلکان ہو رہی ہے... اگر اسے کچھ ہو گیا تو۔''

کریم نے نہایت برہمی سے لڑکی کو دیکھا اور پھر خود ہی نرمی سے بولتا ہوا کہنے لگا: ''میں جانتا ہوں اس ضدی کو، اگر وہ کسی بات پر تل جائے تو پھر اسے خدا بھی نہیں روک سکتا۔ چلو تم گھر چلو...''

شیریں گئی نہیں، کہنے لگی: ''لیکن کہتا تھا کہ تمہارے ابا کے آنے سے پہلے ہی آ جاؤں گا۔''

کریم ہنس پڑا۔ پوچھنے لگا: ''اچھا! تو مجھ سے ڈر بھی رہا تھا۔''

''بہت ڈرتا ہے۔ لڑکی کی آواز باپ کی طبیعت میں تبدیلی دیکھ کر سنبھل گئی، وہ کہنے لگی: ''ماں سے کہہ رہا تھا... ان سے میرے جانے کے بارے میں آپ کچھ نہ بتایئے گا، میں خود ہی بتاؤں گا۔''

وہ دیکھو آ رہا ہے، کتنی تیز سائیکل چلا رہا ہے، ڈر رہا ہو گا کہ کہیں میں اس سے پہلے نہ پہنچ جاؤں۔'' کریم نے کہا تو شیریں نے بھی نظریں جما کر دور سڑک کی طرف دیکھا اور کہا: ''وہی ہے؟ ابھی تو پہچانا نہیں جاتا کہ کون ہے۔''

''وہی ہے۔ میری نظر تو عقاب جیسی ہے۔ بھول چوک ہو ہی نہیں سکتی۔''

کریم ہنس پڑا۔ ''چلو یہی غنیمت ہے کہ صحیح سلامت واپس پہنچ گیا ہے۔''

لیکن جس وقت ننھے کی سائیکل اس پیڑ کے قریب پہنچنے لگی۔ جہاں کریم اور شیریں کھڑے تھے تو کریم آگے بڑھ کر سڑک کے وسط میں کھڑا ہو گیا۔ ننھے قریب آیا—— اور سائیکل سے اتر کر چپ چاپ کریم کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

جناب! کہاں سے تشریف لائے ہیں؟ کریم نے تنی ہوئی آواز میں پوچھا تو ننھے نے نہایت انکساری سے کہا: ''بہت دور سے، ملک الموت کے گھر سے، میں پہلے ہی اس سے کہہ رہا تھا کہ بہت دیر ہو گئی ہے، کریم میاں منتظر ہوں گے۔ مجھ سے برہم ہوں۔''

''اچھا۔'' کریم نے اپنا پورا استحقاق اپنی آواز میں بھر لیا اور بولا: ''ملک الموت سے

تمہاری دوستی ذرا گہری ہو گئی ہے۔ تڑوانی پڑے گی۔''

ننھے نے اپنی پیشانی کریم کے کندھے پر رکھ دی اور آہستہ سے کہا: ''یار تم سب کچھ کر سکتے ہو اگر موت کا فرشتہ بن کر میری بے ہوشی میں میرے ساتھ مکالمہ کر سکتے ہو تو پھر باقی کیا رہ جاتا ہے۔''

کریم نے متعجب ہو کر ننھے کے منہ کی طرف دیکھا تو قریب ہی کھڑی شیریں کہنے لگی ''ابا آپ نے جو کچھ کاغذ پر لکھا تھا، آج انھوں نے اماں سے وہ کاغذ لے کر پڑھا تھا۔''

کریم کو بہت زور سے ہنسی آ گئی۔ کہنے لگا: ''اچھا وہ دوزخ کا حال لیکن وہ تو میں نے بہت ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں لکھا تھا اور پھر وہ تو اُردو میں لکھا ہوا تھا، تم نے کیسے پڑھ لیا؟''

میں نے بھی ایک فرشتہ تلاش کر لیا تھا، اردو پڑھنے والا...'' ننھے نے کہا تو پاس کھڑی شیریں کہنے لگی: ''اماں نے پڑھ پڑھ کر سنایا تھا۔''

گھر پہنچے تو کریم آگے آگے تھا، جیسے دروازے سے سائیکل اندر لاتے دیکھ کر برکت بہت گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی: ''وہ تمہارا کچھ لگتا، نہ جانے کہاں چلا گیا ہے؟''

کریم نے دروازے سے باہر کی طرف دیکھتے ہوئے آواز دی: ''آ جاؤ بھئی میرے کچھ لگتے جب ننھے اندر آ گیا تو کریم نے برکت سے کہا لو ایک بار تو میں اپنا کچھ لگتا واپس لے آیا ہوں، لیکن اگر آئندہ تم نے مجھ سے چوری اسے جانے دیا تو دیکھنا۔''

برکت نے ننھے کو آتے ہوئے دیکھ کر سکھ کا سانس لیا اور اپنے خاوند سے کہنے لگی: ''پھر کل سے ایک ہتھکڑی دے جانا میں اسے باندھ دوں گی۔''

کریم ہنسنے لگا: ''برکت! یہ بے چارہ کریم قادر نہیں جسے ہتھکڑی سے باندھ کر رکھا جا سکے۔''

جواب میں برکت نے کچھ نہیں کہا۔ چولہے پر چائے کا پانی رکھنے کی آواز سنائی دی۔ لیکن اُس کے بجائے اب نعمت بولی: ''تم تو جیسے بندھے ہوئے ہی ہو۔ ایک ہاتھ کو برکت نے ہتھکڑی ڈالی اور دوسرے کو میں نے، لیکن دو ہتھکڑیوں سے تیرا کچھ بھی تو نہیں بگڑا۔''

نعمت نے کریم اور ننھے کے بیٹھنے کے لیے آنگن میں دو چارپائیاں بچھا دی تھیں۔ کریم چارپائی پر بیٹھتا ہوا کہنے لگا: ''بات تو سچی ہے دو ہتھکڑیوں سے میرا کچھ نہیں ہوا۔ اصل میں جنھوں نے انسان کو چار نکاح کرنے کا حکم دیا، دانش کے سرچشمہ تھے۔ اگر دو ہاتھوں کو ہتھکڑیاں درکار ہیں

تو پاؤں کو بیڑیاں بھی۔"

نعمت نے نل کی دھار کے نیچے ہاتھ رکھ کر درجۂ حرارت کو محسوس کیا۔ نل کا پانی ابھی تک ہلکا گرم تھا۔ اس نے ٹھنڈے پانی کی بالٹی نکالنے کے لیے رسی لٹکا دی اور پانی کی بالٹی کھینچتے ہوئے کہنے لگی —— "تو پھر دو نکاح اور کرلو، کوئی حسرت نہ رہ جائے۔"

نعمت نے پانی کی بالٹی کو کھرے پر رکھتے ہوئے ایک تولیہ کریم کو دیا اور ایک نجے کو اور کہنے لگی: "اس اعتبار سے تو ہندو عورتیں اچھی ہوتی ہیں۔ خوش نصیب، عمر بھر آدمی کی ایک ہی عورت رہتی ہے۔"

نجے نے کہا کچھ نہیں، صرف ہنس دیا۔ اور اٹھ کر منہ ہاتھ دھونے لگا لیکن کریم پانی کا چھینٹا منہ پر دیتے ہوئے کہنے لگا: "نیک بختو! وہ خوش نصیب کیسے ہو ئیں اچھی اور خوش نصیب تو تم ہو کہ آدمی کا جی نہیں بھرتا، سوچتا ہے کہ اگر ایک اچھی ہے تو دوسری بھی اچھی ہوگی۔ دوسری اچھی تو تیسری بھی اچھی ہوگی۔ چوتھی بھی... ہندو تو ایک سے ہی توبہ کرلیتا ہے۔ دوسری کا نام تک نہیں لیتا۔"

آنگن میں پانی کے بجائے ہنسی کے چھینٹے اڑنے لگے۔

شیریں نے چائے کے بھرے ہوئے دو گلاس دونوں کے سامنے رکھ دیے تو کریم نے نجے کو وہ ساری بات سنائی جو آج پریس میں ہوئی تھی اور بتایا —— اسی جھگڑے میں آج میں مالک سے پروفوں کی بابت پوچھنا بھول گیا۔

کوئی بات نہیں، آج ترجمے کا کچھ کام مل گیا ہے، نجے نے کہا اور بتایا کہ آج دوپہر وہ اسی کام کے لیے گیا تھا، واپس لوٹتے ہوئے اپنے کمرے میں بھی گیا تھا۔ وہاں چوکیدار سے کمرے کی صفائی کروائی اسی لیے دیر ہوگئی۔

"وہ تو میں سائیکل دیکھ کر ہی سمجھ گیا تھا۔ سائیکل وہیں سے تو لائے ہو گے۔" کریم نے کہا تو نجے نے ذرا جھجک کر کہا: "سوچا تھا کہ رات وہیں سو جاؤں گا لیکن یار کی اجازت نہیں تھی آج، اس لیے حکم کا غلام بن کر آگیا۔"

"دیکھو میاں!" کریم نے سنجیدگی سے کہا یہ تاش کے پتے میں نے کبھی نہیں کھیلے۔ میں نہیں جانتا کہ یہ حکم غلام کیا ہوتا ہے اور چڑیا کی بیگم کیا ہوتی ہے اور پان کا یکہ کسے کہتے ہیں۔ بات بہت سیدھی ہے کہ ڈاکٹر نے کہا ہے —— کہ چار دن یخنی بھی پینی ہے۔ اور آرام بھی کرنا ہے۔ تم

خاموشی سے یہاں بیٹھے رہو، یہ دونوں بیگمیں تیری ماؤں جیسی ہیں۔"

اور نجے کوئی عذر پیش نہ کر سکا۔

شیریں دونوں چارپائیوں کے پاؤں کے ساتھ ٹکے چائے کے خالی گلاس اٹھا رہی تھی کہ چھوٹی جمیلہ نے آواز دی: "دیکھو شیریں! تمہارے موتیے کے بوٹے پر ایک پھول آیا ہے۔"

شیریں نے عجلت میں گلاس اٹھائے اور دوڑ کر موتیے کو دیکھتی کریم کے پاس لوٹ آئی۔ "ابا! تم مجھے روز آٹھ آنے دے دیا کرو۔"

"آٹھ آنے روز؟ وہ کس لیے؟"

"یہ بوٹا تو میں چاچا عطا سے مانگ کر لائی تھی لیکن میں اب اس سے اور کچھ نہیں مانگوں گی، وہ آٹھ آنے میں ایک بوٹا بیچتا ہے۔" کریم نے شیریں کی بات کا پاس کرتے ہوئے کہا: "اچھا... اچھا... کل دے دوں گا آٹھ آنے، تم اس سے ایک خرید لانا۔"

شیریں ہنس دی —— صرف ایک دن نہیں ابا! روز آٹھ آنے، ہر روز ایک بوٹا خریدوں گی تو مہینے میں آنگن بھر جائے گا۔"

اس وقت جیسے کریم کے منہ پر بھی ایک پھول کھل اٹھا تھا۔ اس نے بڑے غور سے لڑکی کو دیکھا۔ لڑکی نے سمجھا —— "شاید والد نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی ہے لیکن کریم نے نہ تو اس کی بات ہی سنی تھی اور نہ ہی کوئی اقرار کیا تھا۔ اسے تو وہ دن آ رہا تھا —— جس دن نعمت کی نیم کو چیر کر دو نیم کرنے کی بات موت کا وہم بن گئی تھی اور شیریں نے آنگن میں موتیے کا بوٹا لگا کر اس وہم کو نکال باہر کیا تھا۔

اور کریم بڑی موج میں آکر اس دن کی بات نجے کو سنانے لگا۔

صبح ہوتے ہی کریم اپنے کام پر چلا گیا تو نجے آنگن میں جہاں نیم کا پیڑ سایہ فگن تھا، چارپائی ڈال کر ترجمہ کرنے میں لگ گیا۔

ایک گھنٹہ تک تو اس کا جی لگا لیکن پھر اچاٹ ہو گیا اور وہ لکھے ہوئے کاغذوں کو لکڑی کے ایک اسٹول پر کتاب کے بوجھ تلے رکھ کر اس پر سستانے کے لیے لیٹ گیا۔

علالت کی تھکن سی تھی لیکن نجے کو محسوس ہوا۔ یہ صرف بیماری کی تھکن ہی نہیں بلکہ یہ بُری کتابوں کے ترجمے کا ردِ عمل بھی ہے وہ جب بھی مالی ضروریات کے تحت اس طرح کے کام

کرتا——تو اس کے ہاتھ کا کہا ماننے سے انکار کر دیتے تھے اور وہ تین چار صفحے لکھنے کے بعد اپنی انگلیوں کو مجبور و نزار محسوس کرنے لگتا۔

بار بار ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ سے دباتا وہ دیر تک چارپائی پر لیٹا رہا۔ کسی کسی لمحے نیم کی سوکھی پتیاں جھڑ کر اس کے جسم پر آ کر گرتیں تو اس کے تھکے ہوئے اعضا سکون سا محسوس کرنے لگتے۔ پھر شاید ہوا کچھ تیز ہو گئی تھی نیم کے پتے کثرت سے جھڑنے لگے اور اسے زبردستی نیند سی آنے لگی۔

نیند کے ایک سپنے کا سکھ اس کے رگ و ریشے میں سرایت کر گیا اس نے دیکھا وہ اپنا نیا ناول لکھ رہا ہے۔ کئی صفحات لکھ کر اس نے ایک طرف ڈھیر کر رکھے ہیں اور مسلسل لکھے چلا جا رہا ہے۔ نہ اس کی انگلیاں تھکتی ہیں اور نہ اس کی نظر تھکتی ہے۔

پھر کریم میاں چائے کا پیالہ خالی کر کے اس کے پاس بیٹھ گیا ہے اور پوچھ رہا ہے——اس ناول کا نام کیا رکھا ہے؟"

وہ کریم کو بتا رہا ہے: "انچاس دن۔"

کریم ہنس رہا ہے۔ لیکن ایک عجیب واقعہ ظہور پذیر ہوتا ہے کہ اس کا اپنا ہاتھ لکھتے لکھتے کاغذ بن جاتا ہے اور اب اس پر ٹپ ٹپ الفاظ گر رہے ہیں۔

وہ کریم کو دیکھ کر زور سے ہنستا ہے اور کہتا ہے۔ دیکھو! یہ کیا کرامت ظہور میں آ رہی ہے؟"

تو اسے لگا——کوئی اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ رہا ہے۔ ہڑبڑا کر اس کی آنکھیں کھلیں تو نعمت اسے جگاتی ہوئی کہہ رہی تھی: "بوندیں پڑ رہی ہیں۔ اٹھو تمہاری چارپائی اندر بچھا دوں۔"

بنجے سپنے کی بات بھول گیا، اسے یاد آیا کہ وہ اسٹول پر لکھے ہوئے کاغذ رکھ کر سویا تھا وہ سبھی بارش میں بھیگ گئے ہوں گے۔ اس نے جلدی سے اسٹول کی طرف دیکھا۔ بارش ہونے والی تھی تو سارے کاغذ شیریں نے اٹھا کر رکھ دیے تھے۔ نعمت نے بتایا تو بنجے کی فکر دور ہو گئی۔

وہ نعمت کے حکم کے بموجب اندر تو چلا آیا مگر ابھی دیکھے خواب نے اس کے پورے وجود میں ایک سنسنی دوڑا دی تھی۔ یہ بھی یاد آیا——کہ وہ پچھلی رات گئے اس وقت سے بے چین ہے جب کریم نے اُسے پریس والی بات سنائی تھی۔

بنجے نے کل رات کریم سے وہ بات سن کر کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن سوچوں میں ضرور کھو گیا تھا کہ کریم نے نہایت آسانی سے جو بات کہہ دی تھی——کہ ملکوں کے حکمراں ملکوں کے بیٹے نہیں داماد ہوا کرتے ہیں۔"

بنجے کو لگا——کہ یہی ایک ناول کا مرکزی خیال ہے جو رات کو اس کے من میں آ رہا تھا اور جو ابھی ایک پودے کی طرح اس کے خوابوں میں اُگ رہا تھا۔

پودے سے اسے رات کی بتائی ہوئی کریم کی وہ بات یاد آ گئی۔ جب اس کی حیات و موت کی کشمکش والی شام کو شیریں نے آنگن میں موتیے کا پودا لگا کر کریم کے من میں اس کے بچ جانے کا یقین پیدا کر دیا تھا۔

بنجے نے اپنے کمرے کے پہلو میں اُگے موتیے کے پودے کو دیکھا تو رات والی شیریں کی وہ بات بھی یاد آئی: "آٹھ آنے کا ایک پودا آتا ہے، ہر روز ایک لاؤں تو مہینے میں آنگن بھر جائے گا۔"

یہ برسات کی پہلی بارش تھی سو جھلک سی دکھا کر دھیمی پڑنے لگی تو بنجے نے شیریں کو آواز دی۔

"چائے بناؤں؟ شیریں نے پاس آ کر پوچھا۔"

"ابھی نہیں——چلو پہلے موتیے کے پودے لے کر آتے ہیں۔"

"کہاں سے؟"

"جہاں سے تم کہہ رہی تھیں۔"

"چاچا عطا سے۔"

"ہاں۔"

"لیکن۔" شیریں چپ سی ہو گئی۔

"وہ اس وقت گھر پر نہیں ہوتا؟ بنجے نے پوچھا۔

"ہوتا ہے لیکن..." شیریں پھر چپ ہو گئی۔

بات بنجے کی سمجھ میں آ گئی کہ ابھی اس نے ابا سے پیسے نہیں لیے، اسی لیے چپ ہے کہنے لگا: "اچھا اماں کو بلاؤ۔"

برکت آئی تو بنجے نے کہا: "یہ میرا کہا نہیں مانتی اماں، آپ اسے کہیں کہ میرے ساتھ چل کر عطا کا گھر بتا دے۔"

''اماں، وہاں سے موتیے کے بوٹے لائے ہیں اور ابا...'' شیریں نے اشارے سے اماں کو بتایا۔

''آج زمین نم ہوگئی ہے۔ اور نم زمین میں بوٹا لگائیں تو سوکھتا نہیں، تم بے شک چاچا عطا سے پوچھ لینا۔'' بنجے نے کہا تو اماں نے انکار نہیں کیا۔

لڑکی سے کہنے لگی: ''چل اس کا جی بھی چاہ رہا ہے آ، جا کر، یہ پاس تو گھر ہے...''

اور اماں جب پیسے نکالنے کے لیے اپنی کوٹھری میں جانے لگی تو بنجے نے کہا۔

''اماں کوئی ٹوکری یا رسی ڈھونڈ دینا، دس پودے ہاتھوں میں نہیں آئیں گے۔''

اماں کچھ سوچ میں پڑ گئی، شاید وہ ایک دو پودوں کے لیے پیسے دینے لگی تھی۔ لیکن دس بیس کا نام سن کر رک سی گئی۔ پھر کوٹھری میں سے ایک ٹوکری لا کر کہنے لگی: ''چاچا عطا سے کہنا: ''تمہارے ابا خود ہی آ کر پیسے دے دیں گے۔''

''اچھا۔'' شیریں نے کہا اور ماں کے ہاتھ سے ٹوکری لے لی۔

بنجے نے عطا کے گھر سے موتیے کے پودوں کے ساتھ آڑو اور انار کے دو پودے بھی لیے اور جب پیسے دینے لگا تو شیریں جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر عطا سے کہنے لگی: ''چاچا...'' عطا بڑے اہتمام سے پودوں کو ٹوکری میں رکھ رہا تھا، اُس کی نظر شیریں کی طرف نہیں تھی، سو بنجے نے شیریں کے ہونٹوں پر ہتھیلی رکھ کر اسے خاموش کرا دیا۔

عطا نے پیسے لے لیے، پودوں سے بھری ٹوکری ان کے حوالے کی تو بنجے باہر گلی میں آ کر شیریں سے کہنے لگا: ''میری اور تیرے ابا کی بات بالکل گھر جیسی ہے، تو کیا گھر کی بات لوگوں سے کہی جاتی ہے؟''

شیریں کچھ شرمندہ سی ہوگئی لیکن ساتھ ہی اُسے کچھ فخر بھی محسوس ہوا کہ بنجے نے خود کو اُن کے گھر کا آدمی کہا ہے۔''

گھر آ کر بنجے نے ٹوکری ایک طرف رکھ دی اور پھر اکیلا جا کر عطا کے گھر سے ایک کھرپا مانگ لایا۔

پہلے شیریں اور جمیلہ نے مل کر آنگن میں ایک ایک فٹ کے فاصلے پر نشانات لگائے۔ پھر بنجے کھرپی سے وہاں چھوٹے چھوٹے گڑھے کھودنے لگا۔

ایک ایک کر کے سبھی پودے لگا دیے تو یہ ویران سا آنگن ایک خوب صورت باغیچے میں تبدیل ہوگیا۔ جس وقت یہ آنگن باغیچہ بنا اس وقت کریم کا بڑا بیٹا سلامت مولوی صاحب کے پاس پڑھنے کے لیے گیا ہوا تھا اور چھوٹا اکبر سو رہا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے وقت سلامت آیا تو آنگن سے گزرتے ہوئے ٹھٹھک کر رہ گیا۔ نعمت دیکھ رہی تھی۔ اونچی آواز میں ہنس کر کہنے لگی: ''ارے! آج تو تمہارے ابا سے بھی یہ گھر پہچانا نہیں جائے گا۔ سوچے گا شاید کسی اور کے گھر جا گھسا ہے۔''

سلامت نے پہلے پودوں کو دیکھا —— پھر شیریں کو اور چڑ کر کہنے لگا: ''مجھے معلوم ہے شیریں نے سب پودے اپنی پسند کے لگائے ہیں میری پسند کا ایک بھی نہیں لگا۔''

بنجے نے سلامت کی یہ بات سنی تو آہستہ سے شیریں سے پوچھا —— کون سا پودا سلامت کو اچھا لگتا ہے؟ تمہیں معلوم تھا؟''

معلوم تھا...'' شیریں نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

''پھر مجھے بتایا کیوں نہیں؟'' بنجے نے کچھ سرزنش کے انداز میں کہا۔

''وہ تو آپ نے خود ہی چن لیا میں کیا بتاتی۔''

''کون سا؟''

''انار کا۔''

بنجے کو دھیمی سی ہنسی آ گئی۔ شیریں سے کہنے لگا: ''اچھا اب تم بولنا مت۔''

اور بنجے نے سلامت کو بازو سے پکڑ کر اپنے پاس کھڑا کر لیا اور کہا کہ: ''ایک سرمہ ہوا کرتا ہے سلیمانی، وہ آنکھوں میں لگالیں تو جو پودا چاہیں نظر آ جاتا ہے۔ اور اگر وہی شیریں لگا لے تو اسے سارے پودے موتیے کے نظر آئیں گے؟'' سلامت کی صورت روتی ہوئی سی ہوگئی تھی۔

''مجھے تو یوں بھی نظر آ رہے ہیں، جیسے نظر نہ آتے ہوں وہ سرمہ لگائے۔'' شیریں ہنسنے لگی۔

''اچھا یہ بتاؤ کہ تم کون سا پودا دیکھنا چاہتے ہو؟'' بنجے نے پوچھا۔

''انار کا۔'' سلامت نے کہا۔

''وہ تمہیں دکھائی نہیں دے رہا۔'' بنجے نے پوچھا۔

''نہیں، میں نے سب دیکھے ہیں، سبھی موتیے کے ہیں۔''

''اچھا تو پھر تم سرمہ لگاؤ۔'' بنجے نے کہا۔

''کہاں ہے وہ سرمہ؟ وہ تو کسی کے پاس ہوتا ہی نہیں، وہ تو یوں ہی کہانی ہے۔''

برکت اور نعمت ہنس رہی تھیں۔ نعمت نے سلامت کے چہرے پر آنسو بہتے دیکھے تو اس کا بازو تھام کر کہنے لگی: ''وہ تو میرے پاس ہے، چلو تمھیں لگا دوں۔''

اور جب نعمت نے چاندی کی سرمہ دانی نکال کر ایک ایک سلائی سلامت کی دونوں آنکھوں میں ڈال دی تو بنجے نے اسے باہر آنگن میں لے جا کر انار کا پودا دکھایا اور کہنے لگا: ''دیکھنا، اس پر کتنے سرخ انار آتے ہیں۔''

''کیا سچ مچ کے؟''

''ہاں سچ مچ کے۔ لیکن تم یہ بتاؤ کہ تمھیں صرف انار کا ہی پیڑ کیوں پسند ہے؟''

بنجے نے پوچھا تو سلامت اس کے کان میں کہنے لگا: ''بھائی جان! سب کے سامنے نہیں بتاؤں گا، رات کو بتاؤں گا، سوتے وقت۔''

شیریں پاس کھڑی ہنسنے لگی۔ اس نے یہ بھی اندازہ لگایا تھا کہ سلامت نے بنجے کے کان میں کیا کہا ہے، ادھر سلامت کے پاس آ کر کہنے لگی: ''میں ابھی بتا دوں۔''

''تمھیں معلوم ہی نہیں، سلامت نے زور سے کہا۔''

''مجھے معلوم ہے۔''

''تو بتاؤ پھر۔''

''وہی بات جس کی کہانی ایک بار ابا نے سنائی تھی...''

''کون سی؟'' سلامت کا چہرہ کچھ اُتر گیا۔ لیکن وہ ضد پر اڑ کر کہنے لگا: ''تمھیں معلوم نہیں۔''

''اچھا تو میں کہے دیتا ہوں۔ وہی انار سے پری نکلنے والی...'' شیریں ہنسنے لگی اور کہنے لگی: ''لیکن وہ تو کہانی ہے، تو نے سچ جان لیا اسے۔''

سلامت کا چہرہ سمٹ کر مختصر سا نظر آنے لگا۔ کہنے لگا: ''تو ابا نے جھوٹ بولا تھا؟''

برکت نے دوپہر کا کھانا تھالیوں میں پٹنا۔ بنجے نے سلامت کو کھانا کھانے کے لیے بٹھاتے ہوئے کہا: ''ابا نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ پریاں واقعی اناروں میں سے نکلتی ہیں۔ لیکن وہ انار کون سے ہوتے ہیں، یہ بڑے ہو کر پتہ چلتا ہے۔''

سلامت کچھ نہیں سمجھا لیکن وہ یوں خاموش ہو گیا جیسے بڑا ہونے کا انتظار کر رہا ہو۔

اُس وقت شام کو جب کریم آیا تو سچ مچ جیسے نعمت نے کہا تھا، دروازے کی چوکھٹ پر کھڑا رہ گیا، ''یا اللہ! یہ اپنا ہی گھر ہے؟''

آج کا دن بنجے کو بھی کچھ شاداب کر گیا تھا، اس نے دوپہر کو تین گھنٹے صرف کر کے تر بتے کا بہت سا کام ختم کر لیا تھا، اب آگے بڑھ کر کریم کا سائیکل تھام کر رکھتا ہوا بولا: ''یہ گھر تو میاں! اب تمہارے مہمان کا بھی اپنا لگ رہا ہے۔''

سلامت آج خوش تھا، آگے بڑھ کر باپ کے بازو لگتا ہوا بولا: ''ابا! تمھیں کون سا پیڑ پسند ہے؟''

یہ سبھی جو تم نے لگائے ہیں۔ کریم نے کہا تو سلامت نے بھی اس کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا: ''اچھا ابا! یہ بتاؤ کہ آپ کو کون کون سے بوٹے نظر آ رہے ہیں؟''

کریم کچھ نہ سمجھا۔ اس لیے کہنے لگا: ''جو جو تمھیں نظر آتے ہیں... مجھے؟ سلامت ہنسنے لگا۔ میں نے تو سرمہ لگا رکھا ہے سلیمانی اس لیے مجھے تو انار کا پودا بھی نظر آتا ہے۔ آپ کو نظر آتا ہے۔''

شیریں اور جمیلہ منہ دبائے ہنس رہی تھیں، اس لیے کریم کو بات کا کچھ اندازہ ہو گیا تھا۔ کہنے لگا: ''تم نے ابھی دس برس کی عمر میں ہی سلیمانی سرمہ لگا لیا ہے...؟''

''ابا! آپ جانتے ہو وہ سرمہ کیا ہوتا ہے؟'' سلامت نے پوچھا تو کریم چارپائی پر بیٹھتا ہوا کہنے لگا: ''یار میرے! زندگی میں ایک بار تو کبھی وہ سرمہ لگاتے ہیں میں نے بھی لگایا تھا لیکن تمہاری عمر کا نہیں تھا بیس برس کا تھا۔''

سلامت باپ سے ہٹ کر بنجے کے پاس آ گیا۔ پوچھنے لگا: ''بھائی جان! آپ نے بھی لگایا تھا سرمہ؟''

بنجے نے پہلے کریم کی طرف دیکھا۔ پھر سلامت کی طرف۔ کہنے لگا: ''ہاں میں نے بھی لگایا تھا۔''

تو پھر آپ کو کیا نظر آیا تھا، سلامت نے یہ سوال کیا تو بنجے نے اس کے گال پر ہلکی سی چپت مارتے ہوئے کہا: ''جب تم بڑے ہو جاؤ گے تو تمھیں بتاؤں گا۔''

سلامت بنجے کو چھوڑ کر پھر باپ کے ساتھ چپک گیا۔ ''تو ابا تمھیں کیا نظر آیا تھا؟ کریم ابھی

بولا نہیں تھا کہ نعمت بول پڑی —— ''ارے مجھ سے پوچھو تمہارے باپ کو ایک پری نظر آئی تھی۔''

''واقعی؟'' سلامت متحیر ہو کر رہ گیا۔ تو کریم نے اسے گود میں لے کر کہا: ''ایک نہیں دو پریاں نظر آنے لگیں۔''

''دو پریاں؟'' سلامت حیران ہو کر باپ کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔

میں نے ذرا سرمہ زیادہ لگایا تھا اس لیے کریم نے کہا تو صبح کی بارش کی طرح آنگن میں ہنسی کی بوچھاریں ہونے لگیں اور برکت نے سب کے لیے کھانے کی تھالیاں چن دیں۔

پھر سونے کے لیے چارپائیوں پر بستر بچھاتے، کریم نے پریس سے لائے ہوئے پروف نجّے کو دیے اور کہنے لگا: ''جلدی نہیں ہے، کل کسی وقت پڑھ لینا، پرسوں لے جاؤں گا۔''

نجّے نے پروف کمرے میں رکھی ترجمے کی کتاب کے ساتھ رکھ دیے لیکن باہر آ کر چارپائی پر بیٹھتا کریم سے کہنے لگا: ''یار! جی چاہتا ہے سب کچھ چھوڑ کر ایک ناول لکھوں۔''

''وہ تو لکھنا ہی ہے۔ اور کیا موت کا فرشتہ بن کر تمھیں زمین پر یوں ہی لایا ہوں۔'' کریم ہنس سا دیا تو نجّے سنجیدہ ہو کر کہنے لگا: ''یار! تم اصل میں تو زندگی کے فرشتے ہو، تمہاری کل والی بات نے مجھے مار دیا ہے؟''

''کون سی؟''

''وہی جو تم نے کہا تھا کہ وطن کے بڑے داماد تو وطن کے رہنما ہوتے ہیں... تم نہیں جانتے تم نے کتنی بڑی بات کہہ دی ہے... اگر وہ سچ مچ دیش کے بیٹے ہوتے، لائق بیٹے تو وطن ہمیشہ ایک سار ہتا۔''

''ہاں یار! اچھے بیٹے تو باپ کی کمائی میں اپنی کمائی شامل کرتے ہیں۔'' کریم نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا:

''تم شاید نہیں جانتے کہ یونان کا ایک پرانا دستور ہے، نجّے نے کہا اور بتایا کہ جو کوئی بھی کسی حکمراں کا داماد بنتا، وہ پہلے راجہ کو قتل کرتا تھا، پھر اس کا تخت سنبھالتا تھا۔''

''اور راجہ کے بیٹے؟'' کریم نے بڑی فکر سے پوچھا۔

''بیٹے کو کبھی حکومت نہیں ملتی۔ حکومت صرف داماد کو ملتی تھی۔'' نجّے نے بتایا ''اور بیٹے کیا کرتے تھے؟''

''اور پھر جو بھی بیٹا جس حکمراں کا داماد بنتا تھا، اسے مار دیتا تھا اور اس کی حکومت سنبھال لیتا تھا۔''

''پھر تو میں بات کو پا گیا ہوں۔''

''کیا؟''

''کہ دنیا ابتدا ہی میں غلط راہ پر چل نکلی تھی۔ اور وہی روایت اب تک چلی آ رہی ہے۔''

''لگتا ہے سچ مچ وہی روایت چلی آئی ہے۔''

''یہ تو آدمی کو خود ہی سوچنا ہے کہ جس کو اپنے مقتول کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں وہ اس کے لڑکے سے کیا ہمدردی روا رکھے گا؟ وہ تو دوسرے کی کمائی کو بے دردی سے پھونک ڈالے گا۔''

''بس یہی بات ہے کریم میاں جو میں لکھنا چاہتا ہوں۔''

''تم لکھنے کا ہنر تو جانتے ہو تو لکھو پھر۔''

''آج دن میں کچھ دیر کے لیے سو گیا تھا اور خواب میں دیکھا کہ لکھ رہا ہوں۔''

''تو چھوڑ دو یہ پروف وروف اور اصل کام کرو۔''

''پر اس کے لیے اب مجھے جانا پڑے گا۔ تم یہ تو سمجھ سکتے ہو کہ یہ کام میں صرف اپنے کمرے ہی میں کر سکتا ہوں۔''

''ہاں یہ تو سمجھتا ہوں۔''

''تو کیا کل میں چلا جاؤں؟''

''اچھا... میں لوٹتے ہوئے تم سے مل آیا کروں گا۔''

''وہ تو میں بھی، جس روز لکھنے کو جی نہ چاہے گا، سائیکل اٹھا کر تمہارے پاس یہاں آ جایا کروں گا۔''

کریم کو نجّے کی بات سے تسلی سی ہو گئی تو وہ بات یاد آئی جسے آج وہ دن بھر ذہن میں پکاتا رہا تھا لیکن گھر آ کر بھول گیا تھا۔ کہنے لگا: —— ایک بات کہنی ہے تم سے۔''

''کیا؟''

''آج میں سوچ رہا تھا کہ سلامت اب دس سال کا ہو گیا ہے، مولوی صاحب سے چار حرف پڑھ کر کیا بن سکے گا؟ اسے اب کام پر لگا دوں۔''

"کریم میاں! اس چھوٹے سے بچے کو ابھی پڑھنے دو، اسے کس کام پر لگاؤ گے؟"

"بات تو سنو! اگر اس عمر کے بچے پریس کے کام میں پڑ جائیں تو اتنے مستعد ہو جاتے ہیں کہ بڑی عمر کے لوگ ان پر رشک کرتے ہیں۔"

"لیکن تھوڑی بہت پڑھائی تو اس کام کے لیے بھی ضروری ہے۔"

"ضروری تو ہے لیکن یہ جو کچھ مولوی صاحب سے پڑھتا ہے، وہ اب اس کے کام نہیں آئے گا۔"

"تمہارا مطلب ہے...؟"

ہاں چار حرف ہندی، پنجابی کے سیکھ لے تو کام آئیں گے۔ اور اگر یہ کمپوزنگ سیکھ لے تو دن بھر میں آٹھ دس صفحے باندھ سکتا ہے، کم از کم چھ تو کہیں نہیں گئے۔ آج کل تین روپے صفحہ تو معمولی بات ہے۔"

"تو یوں کرو... نجے نے سوچا اور کہنے لگا: "یہ کام تم میرے سپرد کر دو اگر اسے اسکول میں ڈالا تو وہاں دو برس میں بھی کچھ نہیں بنے گا۔ گھر میں اسے سالوں کا کام دنوں میں کرا دوں گا۔"

پھر تو بن گیا کام۔ یہ تو مجھے سوجھا ہی نہیں تھا۔ کریم چارپائی پر لیٹے لیٹے اچانک اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کہنے لگا: "میں تو سوچ رہا تھا کہ صبح سے اسے سائیکل پر بیٹھا کر ساتھ لے جایا کروں گا، اور وہاں اسے دیکھ دیکھ کر خود بخود حروف کی شناخت ہو جائے گی۔"

"نہیں اس طرح تو اس کا سال ضائع ہو جائے گا۔"

"سال بھی کہاں، زیادہ ہی لگے گا... بہت کیا تو اسے ٹائپ کو علاحدہ علاحدہ کرنا سکھا دیں۔ دو برس تو اسے بےگاری پر رکھیں گے۔"

میں اسے صبح سے پڑھنا شروع کرا دیتا ہوں... پھر خواہ میں ہر روز نہ بھی پڑھاؤں۔ پھر بھی دیکھنا کہ مہینے بھر میں کہاں پہنچتا ہے؟"

نجے کی بات سن کر کریم کا حوصلہ بڑھ گیا اور وہ اونچی آواز میں پکار کر نعمت سے کہنے لگا:

"دیکھ نعمت! تیرا صاحب زادہ سو گیا ہے یا جاگتا ہے؟"

"کیا بات ہے ابا! میں جاگ رہا ہوں۔" سلامت نے آواز دی اور اٹھ کر پاس آ گیا۔

کریم نے اس کو بازو سے تھام کر اپنی چارپائی کے کنارے بٹھا لیا اور کہنے لگا: "تم اگر

آدمی بننا چاہتے ہو تو صبح سے نجے میاں کو استاد بنا لو، بولو ہر روز پڑھا کرو گے؟"

اور پھر مولوی صاحب سے بھی پڑھنے جاؤں گا؟ لڑکے نے پوچھا۔ تو جواب میں کریم سے پہلے نجے بول پڑا: "وہاں تم اردو پڑھو گے، میرے پاس ہندی، پنجابی اور انگریزی۔"

کریم ہنسنے لگا—— اتنی زبانیں سیکھ کر اس نے عالم فاضل بننا ہے کیا، بس ضرورت کے چار حروف سیکھ لے۔"

نجے نے کریم کو دلیل سے سمجھایا کہ اس عمر کے بچے کئی زبانیں ایک ساتھ سیکھ سکتے ہیں۔ بلکہ بڑی عمر کے نہیں سیکھ سکتے۔ لیکن چھوٹی عمر کے بچے جلدی سیکھ جاتے ہیں۔

"اچھا" کریم نے سلامت کی پیٹھ پر تھپکی دی اور ہنسنے لگا "صبح سے بسم اللہ کہہ کر کافروں کی زبان سیکھنی شروع کر دو۔"

ایک دن کی بات ہے، کریم نے ایک فرما مشین پر چڑھایا اور پہلا کاغذ نکال کر سیاہی کی رنگت دیکھنے لگا تو اس کی نظر وہاں گئی جہاں کتاب کا سن اشاعت لکھا ہوتا ہے۔

کریم نہ ہندی جانتا تھا نہ پنجابی۔ حروف کی غلطی وہ نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن ہندسوں کی غلطی وہ دیکھ سکتا تھا۔ اس نے دیکھا کہ کتاب پر ۱۹۵۸ء لکھا ہوا ہے۔ جس سال وہ پہلے چھپی تھی، اب دوبارہ چھاپتے وقت ۱۹۷۸ء لکھا ہونا چاہیے تھا، اتنا وہ جانتا تھا۔ اس لیے فرما مشین سے اتار لیا اور ہاتھ کا کاغذ پکڑ کر مالک کے کمرے کی طرف چلا گیا۔

"یہ بہت بڑی غلطی رہ گئی ہے جناب۔" کریم نے وہ صفحہ مالک کی میز پر رکھ کر ۱۹۵۸ء کے ہندسوں کی طرف اشارہ کیا۔ مالک نے سرسری نظر ڈالی اور کہا: "کوئی بات نہیں چھاپ دو صفحہ۔"

"یہ تو کتاب کا نیا ایڈیشن چھپ رہا ہے جی۔"

"ہاں... ہاں..."

یہ پروف کی غلطی رہ گئی ہے جناب۔"

"کوئی نہیں، چلنے دو! مالک نے کہا اور اپنی نظر میز کے نیچے رکھے کاغذوں پر ڈال دی۔ کریم نے اپنی طرف سے جو بہت بڑی غلطی تلاش کی تھی وہ مالک کی نظر میں غلطی ہی نہیں تھی۔ کریم یہ بات سمجھ نہیں پا رہا تھا اس لیے کھڑا رہا۔ اور کہنے لگا: "لیکن جناب اس پر تو چند منٹ لگتے ہیں۔"

ابھی فرما کھلوا کر غلطی درست کروا دیجیے۔''

مالک نے دیکھا ـــــ کریم بات پر اڑا ہوا ہے اس لیے کہنے لگا: ''فرما مشین پر چڑھا ہوا ہے، اتاروگے تو یوں ہی گھنٹہ بھر لگ جائے گا، پھر فرما کھولنا پڑے گا... مشین خالی پڑی ہی رہے گی، چھاپ دو اسی طرح۔''

کس لیے جناب ـــــ فرما تو میں نے مشین سے اتار دیا ہے، بس کسی کمپوزیٹر سے کہہ دیجیے، منٹ بھر میں کھول کے ہندسہ بدل دے اور کرنا ہی کیا ہے...''

''کریم میاں یہ تمہاری بہت بُری عادت ہے۔'' مالک نے جھنجھلا کر کریم کی طرف دیکھا اور کہنے لگا: ''تم بحث بہت کرتے ہو۔''

''کہا تو آپ کے بھلے کے لیے ہے۔'' کریم کی آواز نحیف ہوگئی اور مجھے کیا لینا دینا ہے اس میں سے۔''

''نہیں لینا دینا تو بحث کیوں کرتے ہو۔'' تمھیں ایک بار جو کہا ہے ـــــ چھاپ دو صفحہ تم ایک بار نہیں سنتے؟''

مالک کی آواز جیسے سارے کاغذوں پر سیاہی کی طرح اُلٹ گئی۔ کریم کو لگا اب میز پر رکھے ہوئے کاغذ کا کوئی حرف بھی اسے نظر نہیں آرہا ہے۔

مالک کو اس روز والی بات یاد آگئی ـــــ جب کریم نے کمپوزیٹروں کے ڈبوں سے چوری کا مال برآمد کیا تھا۔ سو کچھ نرمی سے اس نے کریم کی طرف دیکھا اور کہا: ''کریم میاں! تم بیگانے نہیں ہو، اپنے آدمی ہو، لیکن بحث کے بجائے اشارہ سمجھا کرو۔''

کریم یہ اشارہ پھر بھی نہیں سمجھا۔ ٹک ٹک مالک کا منہ تکنے لگا۔

دیکھو نا کئی باتیں ہوئی ہیں... مالک نے کچھ نرم لہجے میں کہا: ''جو آپ لوگ نہیں سمجھ سکتے اور نہ ہی آپ کو سمجھنی چاہئیں۔''

کریم خاموشی سے کمرے سے نکلنے لگا تو مالک نے روک لیا، کہا: ''سنو! تم بہت اچھے کارکن ہو لیکن صرف کام کی مہارت ہی ساری بات نہیں ہوتی۔ کارکن کو مالک کا اشارہ سمجھنے کی مہارت بھی ہونی چاہیے۔''

کریم کی نظر مالک کے منہ پر ایستادہ رہ گئی جیسے اس کا اشارہ سمجھنے کا ہنر سیکھ رہا ہو۔

''اچھا جاؤ اپنا کام کرو۔'' مالک نے کہا تو کریم کی نظر لرز کر بیرونی دروازے کی طرف چلی گئی۔ لیکن یوں ـــــ جیسے وہ کچھ بھی نہ سمجھا ہو وہ کمرے سے باہر آکر اپنے مشین والے کمرے کی طرف مڑا تو اس نے دیکھا ـــــ پریس کا سب سے پرانا اور بوڑھا کمپوزیٹر موہن سنگھ دروازے کے ساتھ والی دیوار سے لگا ہنس رہا تھا اور پھر اس نے دیکھا کہ وہ اس کے پیچھے مشین والے کمرے میں آگیا۔

کریم جب مشین سے اتارے ہوئے فرمے کو دوبارہ مشین پر چڑھانے لگا تو موہن سنگھ نے اس کے قریب آکر آہستہ سے پوچھا: ''کیوں میاں! آج کوئی نیا ہنر سیکھ کر آئے ہو یا نہیں؟''

کریم چپ چاپ اس کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔

''پھر تم اشارہ سمجھے کہ نہیں۔'' موہن سنگھ ہنس پڑا اور کہنے لگا: ''بات بہت سیدھی سی ہے ـــــ یہ کہ کتاب دوسری یا تیسری بار نہیں چھپ رہی...''

''نہیں چھپ رہی؟ تو پھر میں ان کورے کاغذوں پر کیا چھاپ رہا ہوں۔'' کریم نے پہلے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا، پھر کورے کاغذوں کی طرف، پھر مشین کی طرف...''

تم سمجھ لو کہ نہیں چھپ رہی بلکہ انھی دنوں سے چھپی رکھی ہے ـــــ جب پہلی بار چھپی تھی... موہن سنگھ نے ایک بار پیچھے دروازے کی طرف دیکھا اور پھر بڑبڑانے لگا۔

کریم کچھ نہ بولا تو موہن سنگھ کہنے لگا: ''تم تو صرف ہندسے پڑھ سکتے ہو وہ تم نے پڑھ لیے نیچے لفظوں میں جو کچھ لکھا ہے وہ تمھیں پڑھ کے سناؤں؟''

کریم پھر کاغذ کی طرف دیکھنے لگا۔

یہ دیکھو، نیچے لکھا ہوا ہے'' پہلی بار ۱۹۶۸ء میں بھی پہلی بار ہی تھی، پھر جب شاید ۷۲ یا ۷۳ میں چھپی تھی، جب بھی پہلی بار ہی تھی، اور اب ۱۹۷۸ء میں بھی پہلی بار ہی ہے۔''

''سمجھ گیا جناب، یہ ہمیشہ پہلی بار ہی رہے گی۔'' کریم اپنے ہاتھوں پر لگی سیاہی کو جیسے اپنے ہونٹوں سے پونچھ رہا تھا اور اس کا منہ بہت کڑوا ہو گیا تھا۔

موہن سنگھ نے ایک بار پھر دروازے کی طرف دیکھا اور کہنے لگا: ''کچھ ایسی بھی خراب کتابیں ہوتی ہیں جو بکتی ہی نہیں۔ اس کا مصنف جب بھی پوچھتا ہے کہ کتاب کتنی تعداد میں بکی ہے تو اسے پتہ چلے گا کہ اس کی کتاب تو بکتی ہی نہیں... تم بتاؤ سمجھے ہو یا نہیں۔''

"نہیں۔" کریم نے بہت سنجیدہ چہرے کے ساتھ کہا۔

"دیکھنا! کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو ہم لوگوں کے پلّے ہی نہیں پڑ سکتیں۔"

موہر سنگھ نے دروازے سے باہر کھڑے ہو کر یہ جملہ بھی سنا تھا جو مالک نے کریم سے کہا تھا اس لیے وہ ہنس دیا اور کہنے لگا: "سو اب تم سمجھ گئے ہو۔"

کریم کہنے لگا: "ہمارا مالک ہمیشہ لوگوں کی لکھی ہوئی کتابیں چھاپتا ہے، ایک کتاب خود اسے بھی لکھنی چاہیے۔"

"وہ کیا؟"

"تم نے سن رکھا ہے کہ ایک بہت مشہور کتاب ہوا کرتی تھی —— "ہدایت نامہ خاوند"

"ہاں پڑھی تو نہیں، لیکن اس کے بارے میں سن رکھا ہے، اس کے بہت اشتہار چھپا کرتے تھے۔"

"اور اسی طرح کی ایک کتاب ہوتی تھی "ہدایت نامہ بیوی۔"

"ہوا کرتی تھی..."

"اب ہمارے مالک کو ہدایت نامہ کارکن لکھنی چاہیے۔"

موہر سنگھ ہنستا ہنستا کریم کے کندھے پر ایک تھپکی دے کر کمرے سے نکل گیا اور پھر جب وہ مشین پر فرما چڑھا کر —— فرما چھاپ رہا تھا —— باہر کمپوزیٹروں کے کیبنوں کی طرف سے کئی بار اونچی آواز میں بولنے کا شور گونجا تو کریم سمجھ گیا کہ موہر سنگھ ہدایت نامہ کارکن والی بات باقی کمپوزیٹروں کو بھی سمجھا رہا ہے۔

شام کو جب چھٹی ہوئی تو کریم نے گھر جانے کے بجائے اپنی سائیکل ننجے کے کمرے کی طرف موڑ دی۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے خیال آیا کہ شاید وہ لکھ رہا ہو اور اس کے آنے سے بیجا مداخلت بھی ممکن ہے لیکن کریم سے اپنے پاؤں آج روکے نہیں رک رہے تھے۔

ننجے نے کریم کو دیکھ کر ہاتھ کا قلم جہاں تھا وہیں چھوڑ دیا اور کہا: "آؤ کریم میاں! تمہاری عمر بہت لمبی ہے۔"

"بھلا کتنی ہے؟" کریم دیوان پر بیٹھتا پوچھنے لگا: "تمہارے ناول جتنی ہوگی؟"

"میرے ناول کی تو صرف انچاس دن ہے۔"

"بھئی، وہ تو ذکر ہوا انچاس دن کا، ناول کی عمر تو کئی زندگیاں ہوں گی۔ جانے کتنی نسلیں اسے پڑھیں گی۔"

ننجے ہنسنے لگا۔ "جانے پڑھیں گی بھی یا نہیں۔ ویسے تم نے ٹھیک کہا ہے۔ ہر ناول لکھنے والا کم از کم پانچ سات نسلوں کی بات ضرور سوچتا ہے۔"

"میں نے بھی تو یار! یہ بات ایک تخمینے کے مطابق کہی ہے یوں ہی نہیں کہہ دی۔"

"تمہارے اس ناول میں موت کے جس فرشتے کا ذکر ہوگا وہ میں ہی تو ہوں، سو جب تک ناول زندہ رہے گا تو میں بھی زندہ رہوں گا۔"

ننجے زور سے ہنسا۔ "اس تمہارے اندازے نے مجھے لاجواب کر دیا ہے۔ میاں کریم پاؤں سے جوتا نکال کر دیوان پر نیم دراز ہو گیا اور کہنے لگا: "سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ یونہی جا کر کام میں مداخلت کا باعث بنوں گا۔ بات ہوئی بھی وہی۔ تم نے قلم کو وہیں چھوڑ دیا ہے۔"

لیکن تم نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ میں نے تمھیں دیکھ کر تمہاری بڑی عمر کی پیشین گوئی کیوں کی ہے؟"

"ابھی کہیں یاد کیا ہوگا۔"

"سو پھر مداخلت کیسی ہوئی، یاد تو اسی لیے کیا تھا کہ قلم رک رہا تھا اور میں جانتا ہوں کہ قلم کو جنبش دینا ہو تو آدمی تمہارے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرے۔"

"اچھا پھر چوکیدار کو آواز دو کہ برابر والی دکان سے دو گلاس چائے کے لے آئے۔"

"وہ کیوں چائے میں اسٹو پر خود بناؤں گا یہاں، ایک مدت ہوئی تم سے بلّھے شاہ نہیں سنا، بس تم ذرا اس کی تان اُڑاؤ اور اتنے میں چائے تیار ہوئی۔"

"یار! بلّھے شاہ گانے کے دن لد گئے اب تو میں حضرت سلیمان بننے کے چکر میں ہوں۔"

ننجے نے اسٹو جلا کر چائے کا پانی رکھا اور کریم کے پاس دیوان پر بیٹھا پوچھنے لگا کیا کہا ہے۔

"یہی کہ اب مجھے حضرت سلیمان بن جانا ہے۔"

"وہ کون تھا؟"

"لو تم نہیں جانتے، حضرت داؤد کا بیٹا، جو بنی اسرائیل کا بادشاہ تھا۔" کریم نے کہا اور ہنسنے لگا۔

''اچھا کنگ سولومن۔ تو تم بادشاہ بننا چاہتے ہو، پھر تو بن گئی بات۔ تم بادشاہ اور میں تیری رعایا... لیکن یار! کہیں بادشاہ بن کر آنکھیں پھیر نہ لینا یہ مل کر چائے پینے کے دن یاد رکھنا۔''

''بادشاہ میں کیوں بنوں گا، میں تو کسی اور خیال سے کہہ رہا ہوں۔''

نجے اٹھ کر گلاسوں میں چائے انڈیل لایا اور پھر کریم کے پاس بیٹھتا کہنے لگا۔

''اچھا پھر اور کس لیے حضرت سلیمان بننا ہے؟''

کریم نے چائے کے دو گھونٹ لیے اور کہنے لگا: ''دیکھونا! اس پر خدا کی ایک بخشش تھی۔ خدا نے اسے علم غیب عطا کر رکھا تھا، جس سے وہ جانوروں کی زبان بھی سمجھ سکتا تھا۔''

''اچھا، پھر؟''

''بادشاہ بننے کی تو کوئی حسرت نہیں لیکن یہ حسرت ضرور ہے کہ میں جانوروں کی بولی سمجھ سکوں۔''

نجے ہنسنے لگا۔ ''تم کس کی بولی سمجھتے ہو؟ چڑیوں کووں کی، فاختاؤں، قمریوں کی یا کسی اور پنکھ پکھیرو کی؟''

''نہیں بھئی! ان معصوموں کی بولی تو آپ کی آپ روح میں اتر جاتی ہے، میں تو ان جانوروں کی بولی سمجھنا چاہتا ہوں جو دیکھنے میں آدمی ہیں مگر چیلوں اور کرگسوں کی زبان بولتے ہیں——

نجے نے کریم کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دبا لیا۔

کریم نے آج صبح پریس میں ہونے والا سارا واقعہ دوہرایا اور کہنے لگا۔ ''بس نجے یار! اس دنیا میں آدمی جہاں بھی کام کرے وہاں مالک کا اشارہ سمجھنے کے لیے جانوروں کی بولی آنی چاہیے، وہ مجھے نہیں آتی، بتاؤ میں کیا کروں؟''

''مکان کا کرایہ دینا تھا۔ اور پھر روٹی اور اوپر کے متفرق اخراجات کے لیے بھی کچھ پیسوں کا ہاتھ میں ہونا ضروری تھا۔'' اس لیے اپنا ناول شروع کرنے سے پہلے نجے نے کتنے دنوں تک خود کو شب بیداری لینی چکی کی مشقت میں مبتلا رکھا۔ اور ترجمے اور پروف ریڈنگ کا سارا کام ختم کر لیا اور پھر اپنی پیاسی روح کو لے کر سوچوں کی بہتی ندیوں کے کنارے آکر بیٹھ گیا۔

پچھلے جتنے دنوں سے وہ ناول لکھ رہا تھا۔ اپنے من کے ساگر میں نہا بھی رہا تھا... جس سے اس کے ایک ایک انگ کو سکون مل رہا تھا۔

یہ حیات بعد الموت کے ابتدائی دنوں کا جو تجربہ اس کے ذہن میں تھا۔ خواہ وہ اس کے بخار کے دنوں کے خوابوں کی بنیاد پر تھا۔ اور کچھ تحقیقی فلسفے کی اساس پر—— لیکن یہی سب کچھ اس ناول کے ابتدائی صفحات کا محور تھا اور جسے لکھتے لکھتے وہ ایک بار پھر قیاسی میں سے گزر رہا تھا۔

یہ حیات بعد الموت کے وہ ایام تھے—— جب اس کے قیاس کے مطابق ایک روح جسم کے حصار سے رہائی پا کر آسمانوں کی ہلکی نیلی روشنی میں سفر کرتی ہے اور اس بیان کو الفاظ کا جامہ پہناتے احساس کے تیکھے پن اور شدت کے بنا پر وہ خود بھی کئی دنوں سے کھلے آسمان پر محو پرواز تھا اُس کے جسم کے سارے انگ جیسے اس کی روح پر پروں کی طرح اُگ آئے تھے۔

لیکن ناول کے پہلے حصے کے بعد آج شام کے ہنگام، جب اس نے آنے والے ایام کا ذکر شروع کیا—— جب اس کے قیاس میں کئی دنوں تک لگاتار نظر آنے والی روشنی کے بعد آسمانوں پر ایک ہفت رنگ دھنک پھولتی ہے—— تو اس کے جسم میں آگ جیسی کتنی ہی سرخ لکیریں بننے لگیں۔

اپنے بخار کے دنوں میں اس نے اس ہفت رنگ دھنک پر بیتا کو بیٹھے دیکھا تھا اور وہی جب اس کے کاغذ پر اُترنے لگی تو نجے کو ایک عجیب بے بسی کے ساتھ بیتا یاد آنے لگی۔

سوچنے لگا—— یہی زمین تھی، یہی بڑا سا کتنے ہی کرایہ داروں والا گھر تھا۔ جس میں اُس کے اپنے کمرے کی بالائی چھت پر بیتا کا کمرہ ہوا کرتا تھا۔

اور نجے نے ناول کے صفحوں کو ایک طرف رکھ کر، گھڑی بھر کے لیے آسمانوں کی ہفت رنگ دھنک آسمانوں کو ہی واپس لوٹا دی اور دیوان پر لیٹ کر زمین کے ان دنوں کو یاد کرنے لگا۔ جب بیتا سچ مچ زندہ تھی اچانک اس کی روح کو لگے پر اس کے گوشت پوست کے اعضا بن گئے اور ایک جوان مرد کے اعضا کی طرح بیتا کے وجود کے لیے تڑپ اُٹھے بیتا اب کہیں نہیں ہے۔ یہ احساس کہیں اس کے وجود میں بھی تھا، اس لیے تمام تنے اور کسے ہوئے اعضا کا درد ایک پچھتاوے کی طرح سلگنے لگا کہ بیتا جب زندہ تھی تو اس نے ایک بار بھی کیوں اُسے اپنی آغوش میں سمیٹ کر نہیں دیکھا؟

اُس نے موت سے زندگی کا قرض کیوں مانگا تھا؟

وہ جانتا تھا —— نیتا جب ملی تھی، موت کے کنارے کھڑی تھی لیکن یہ کنارہ ابھی زمین کا ایک حصّہ تھا۔ زمین کے وجود کا ایک ٹکڑا، پھر اس نے کنارے والے پل پانیوں میں کیوں پگھل جانے دیے؟

سنجے تڑپ کر دیوان سے اُٹھا، ایک سگریٹ سلگائی اور سوچنے لگا تبتی فلسفے کا جو حصّہ جس میں حیات بعدالموت کا تذکرہ ہے، پہلے ہی کہیں اپنے وجود پر جھیل لیا ہے —— موت سے کہیں بہت پہلے۔

مرنے کے بعد تو صرف روح باقی رہتی ہے —— مابعدالطبیعاتی وجود، صرف آگ اور ہوا کا پیکر جسے ہاتھ سے چھونا ممکن نہیں۔ سنجے کا جسم دھوئیں کی لکیر کی طرح کانپ گیا اور سوچنے لگا۔ لیکن میں نے اس گوشت پوست کے بدن کو مابعدالطبیعاتی وجود کیسے بنا لیا تھا؟ اور نیتا جب زندہ تھی اُسے بھی مابعدالطبیعاتی وجود ہی سمجھ لیا؟ میں اُس سے یوں ملا —— جیسے ایک روح دوسری روح سے ہمکنار ہوتی ہے۔ میں اسے ایک جیتی جاگتی عورت سے ایک جیتے جاگتے مرد کی طرح کیوں نہ ملا۔ اور سنجے اپنے سگریٹ میں سے جھڑی ہوئی راکھ کی طرح دیوان پر ڈھے گیا۔

راکھ شاید ابھی گرم تھی۔ سنجے نے خود کو دلیل دی —— یار سنجے! نیتا شادی شدہ تھی، بیمار تھی اُسے پانے کا وقت نہ تھا اور وہ راکھ ٹھنڈی ہو کر مٹی میں بکھر گئی۔ سنجے کو لگا —— اب میں کبھی نہ جان سکوں گا کہ جس عورت سے کوئی محبت کرتا ہے اس عورت کے جسم کو چھونا کیا ہوتا ہے۔

سلامت کو پڑھانے کے لیے سنجے نے کوئی دن اور وقت طے نہیں کیا ہوا تھا۔ جب بھی دوسرے یا تیسرے دن اُسے دو گھنٹے کی فرصت ملتی وہ چلا جایا کرتا لیکن اتوار کے دن وہ ضرور جاتا کیوں کہ اُس دن کریم کی چھٹی ہوا کرتی تھی۔

اس اتوار کی صبح کو سنجے متواتر کئی گھنٹے تک لکھتا رہا۔ جب دوپہر ہونے لگی تو بھوک بھی چمک اُٹھی اور کریم سے ملاقات کی چاہت بھی، اس لیے سائیکل لے کر وہ کریم کے گھر کو چل دیا۔ کریم والی گلی کا موڑ کاٹ کر بمشکل تین مکان عبور کیے تھے کہ آواز آئی: ”سنجے میاں! تمہارا کریم لالہ تو یہاں بیٹھا ہے۔“ سنجے سائیکل سے اُترا، پیچھے مڑ کر دیکھا، ایک بوڑھا سا آدمی گھر کے دروازے میں کھڑا اُسے ہاتھ کے اشارے سے واپس بلا رہا تھا۔“

سنجے نے سائیکل موڑ دی۔ دروازے سے اندر جھانکا —— سامنے چارپائی پر کریم بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔

”چلے آؤ چلے آؤ یار! یہ تو اپنے فتّے یار کا گھر ہے۔“ کریم نے کہا اور چارپائی سے اُٹھ کر سنجے کی سائیکل دروازے کے ساتھ کھڑی کر دی۔

سنجے چارپائی پر بیٹھے ہوئے ہنس دیا۔ ”سو آج تیرے فتّے یار نے تمھیں کریم لالہ بنا دیا ہے۔“

فتّے نے عینک کی ٹوٹی ہوئی کمانی کی جگہ دھاگا باندھا ہوا تھا جسے کھینچ کر کان سے لپیٹ رکھا تھا جو کچھ ڈھیلا ہو گیا تھا۔ اسے کان سے کھول کر دوبارہ اچھی طرح لپیٹتا ہوا کہنے لگا اسے تو میں یوں بھی کریم لالہ کہہ کر ہی بلاتا ہوں، آپ کو ہی سنجے صاحب آج میں نے سنجے میاں کہہ کر آواز دی ہے ”... آپ یار جو ہوئے، یاری میں لوگ پگڑیاں بدلتے تھے، اب پگڑیاں تو رہی نہیں —— سو میں نے سوچا کم از کم آپ کے نام ہی ایک دوسرے کو دے دوں۔“

سنجے کو یہ بوڑھا فتّا بے حد دلچسپ لگا۔ وہ آنگن میں تیار شدہ چکنی مٹی اور چاک کو دیکھتا ہوا کہنے لگا —— ”بزرگوار آپ کا نام فتّہ کس نے رکھ دیا، ہمارے فضل شاہ نے تو آپ کا نام تلا کمہار رکھا تھا۔

یہ سن کر کریم ہنس دیا اور بولا: ”فتّے! کچھ سمجھے ہو؟“

”نہیں سمجھا۔“ کہہ کر فتّہ بتانے لگا، مجھے تو یہی معلوم ہے کہ ابا جان نے بڑی محبت سے میرا نام فتح محمد رکھا تھا۔ لیکن تقدیر کیا بگڑی کہ میرا نام بھی بدل گیا اور میں محض فتّہ رہ گیا۔ لیکن سنجے میاں نے اور بات کہی ہے کریم بتانے لگا: ”لوگ ہیر گاتے ہیں، وہ تو تم نے سن رکھی ہے نا۔ اس کا قصّہ وارث شاہ نے کہا اور ہیر جیسی ایک سوہنی بھی ہوا کرتی تھی۔ فتح بیچ میں بول پڑا، بھلا سوہنی مہیوال کا قصّہ کس نے نہیں سن رکھا، وہی جو رات کو دریا عبور کر کے اپنے یار کو ملنے جایا کرتی تھی...

یہ بھی اسی کی بات کرتا ہے، اس کا قصّہ فضل شاہ نے لکھا تھا۔

”سمجھ گیا“ ”وہ کمہاروں کی بیٹی تھی نا...“

”اچھا... اچھا... تبھی کہہ رہا ہے کہ میرا نام تلا کمہار رکھنا چاہیے تھا۔“ لیکن سنجے میاں فتّہ کی بات کرتے کرتے باتوں کو دانتوں میں ہی کہیں گم کر گیا۔

اب تو اس کے ہاتھ پاؤں نہیں چلتے لیکن ننھے یار! سچ سچ ایک زمانہ تھا کہ فتا اپنے چاک سے اس طرح کی شکلیں اتارا کرتا تھا کہ جن کی گردنیں دیکھ کر لڑکیوں کی گردنیں بھول جایا کرتی تھیں۔

کریم نے بتایا، کچھ ہنس بھی دیا اور پھر ادھر خالی آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔

''سچ کہتے ہو ننھے میاں! بھلا کیا نام تھا اس کپج کے والی کا جو ایک دن اس کے گھر آیا تھا۔ فتے نے آدھی بات ننھے سے کہی تھی اور آدھی کریم سے۔'' کریم نے بتایا۔ میاں! وہ عزت بیگ تھا شہزادوں جیسا خوب صورت لیکن سوہنی کو دیکھ کر واپس نہ لوٹ سکا۔

فتے نے ایک آہ بھری اور کہنے لگا —— یوں ہی ایک دن آیا ہوگا جیسے آج ننھے میاں میرے گھر آئے... کریم لالہ! یہ تمہارا یار بھی تو شہزادہ لگتا ہے، کریم نے ذرا مسکرا کر ننھے کی طرف دیکھا، پھر فتے سے کہنے لگا —— ''اچھا یہ ہمیں عزت بیگ جیسا لگتا ہے؟ لیکن خدا شاہد ہے، جھوٹ نہ بولنا، اگر آج تمہاری بیٹی سلمٰی اس آنگن میں کھڑی ہوتی تو میرا یہ شہزادہ تمھیں اس کے لیے قبول ہوتا؟''

ننھے کو نہ فتے کی بات سمجھ میں آ رہی تھی نہ کریم کی اور اس نے دیکھا —— فتے نے اوپر آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے اور کہنے لگا: ''میرے نصیب میں کچھ بھی نہیں کریم میاں! اب یوں ہی میرے زخموں پر نمک کیوں چھڑکتے ہو...''

کریم نے آہستہ سے ننھے کو بتایا —— بے چارہ قسمت کا مارا ہے، پہلے اس کی بیوی اللہ کو پیاری ہوگئی، ایک ہی بیٹی تھی سلمٰی، بہت مشکلوں سے پالی ہوئی، جوان ہوئی تو وہ بھی اللہ کو پیاری ہوگئی۔ اس کی صورت اسے بھولتی نہیں۔ اسی کی بات کر رہا ہے... اس کی عمر تو زیادہ نہیں، جوانی میں ہی بڑھاپا اتر آیا ہے۔''

ننھے کو فتے کا درد محسوس ہونے لگا، اس نے اس سے کچھ نہیں کہا لیکن یوں لگا جیسے پل بھر کے لیے فتے نے اسے عزت بیگ قیاس کر کے سوہنی کے گم ہونے کے درد کو چھو لیا ہو۔

چارپائی سے اٹھتے ہوئے ننھے نے کہا: ''چلو کریم میاں! گھر چلیں، تھوڑی دیر کے لیے سلامت کو پڑھا دوں۔''

''چلو۔'' کریم نے کہا لیکن اُٹھا نہیں۔

''تم ہو بیٹا، اب گھر کو جاؤ، اسے فتے نے کہا، صبح سے ہی گھر سے ناراض ہو کر یہاں آ بیٹھا

ہے... صبح سے ایک لقمہ بھی منہ تک نہیں لے گیا میں نے بہت منتیں کی ہیں کہ کچھ کھا لے لیکن روزہ رکھ کر بیٹھا رہا ہے۔

''کیا بات ہوگئی میاں؟ میں تو گھر سے بھوکا چلا تھا کہ دعوت اپنے یار کے گھر ہے۔ تم نے مجھ سے بھی روزہ رکھوانا ہے؟ ننھے نے کہا تو کریم حقہ چھوڑ کر چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ چلو پھر! آج تو خود ہی روٹیاں پکائیں گی، آج وہاں نہ تو چولہے میں آگ ہے نہ گھڑے میں پانی۔''

''ایسی کیا بات ہوگئی۔'' ننھے نے بڑی تشویش سے پوچھا تو کریم اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا —— ''لیکن آج مجھے ایک راز کی بات معلوم ہوگئی ہے۔''

''کیا؟''

''کہ حضرت سلیمانؑ نے جانوروں کی زبان کس طرح سیکھی تھی...''

''تم تو کہتے تھے کہ انھیں خدا کی بخشش تھی۔''

''وہ تو کتابیں لکھنے والوں نے بات بنائی ہے لیکن اصل بات کیا تھی مجھے معلوم ہوگیا ہے۔''

''اچھا، کیا آج کوئی الہام ہوا ہے تمھیں؟''

''الہام ہی سمجھ لو، تمھیں پتہ ہے اس کی کتنی بیویاں تھیں، کریم ہنس سا دیا: ''مجھے پتہ نہیں۔''

''سات سو بیویاں اور تین سو کنیزیں، پھر ایک ہزار عورتوں کی لڑائی میں اس نے جانوروں کی بولی تو اپنے آپ سیکھ لی تھی...'' کریم نے کہا تو ننھے مسکرا پڑا۔ پوچھ فتے سے۔ آج ساری گلی کے لوگ سن رہے تھے... کریم نے پھر کہا تو فتہ بھی پاس سے کہنے لگا، بھئی اب بس کرو، گھر بستے ہی اچھے لگتے ہیں، برتنوں کا کیا ہے، وہ تو آپس میں ٹکراتے ہی رہتے ہیں اور پھر بات سنو! بیویاں کوئی مٹی کے برتن تو ہوتی نہیں جو ٹوٹ جائیں گی، وہ تو پیتل کی تھالیاں ہوتی ہیں۔

فتہ ہنسنے لگ گیا تو کریم بھی کچھ ہنس دیا۔

کریم ننھے کو ساتھ لیے گھر آیا تو آنگن کے ایک کونے میں لگے ہوئے نئے تندور میں نعمت روٹیاں لگا رہی تھی۔ ننھے نے دروازے کی ایک سمت کے ساتھ لگا کر سائیکل کھڑی کی اور جلدی سے کہا: ''چھوٹی اماں! میں نے تو سنا تھا کہ آج مجھے روزہ رکھنا ہوگا۔''

نعمت کا منہ تندور کی حدت سے کچھ سرخ سا ہو رہا تھا۔ ننھے کی طرف دیکھتی شرما کے ہنس

پڑی تو منہ کا رنگ اور سرخ ہوگیا۔ کہنے لگی: ''علم کا حرف سلامت کے پیٹ میں ہی ڈالتے ہو کچھ اس کے باپ کو بھی دے دیا کرو۔''

کریم آنگن میں چارپائی بچھاتا کہنے لگا: ''لاؤ بھئی نجے! روٹی کا لقمہ تو صبح سے اندر گیا نہیں تم چار حرف ہی لاؤ، میں پیٹ میں ڈال لوں۔''

نعمت کو ہنسی آنے لگی لیکن اس نے ضبط کر کے منہ دوسری طرف کرلیا اور کہنے لگی: ''تو کیا گھر سے روٹھ کر دوسروں کے گھر جا کر بیٹھ رہنا عقل والوں کا کام ہوتا ہے؟''

''دیکھو بھائی جان! میں نے کتنے صفحے لکھ رکھے ہیں، سلامت نے لکڑی کے اسٹول پر کاپی رکھ کر نجے کو دکھائی تو نجے نے ایک نئی سطر کاپی پر لکھ کر اسے بیس بار مشق کرنے کو کہا اور خود برکت کے کمرے کی طرف آواز دی، بڑی اماں! برکت نے اشارے سے اسے اندر بلا لیا اور اشکوں سے نم آنکھوں کو ایک بار پھر پونچھ کر اُس کے بیٹھنے کے لیے چارپائی کی طرف اشارہ کیا۔

پھر آہستہ آہستہ برکت نے بتایا کہ آج کیا بات ہوئی تھی۔

اصل میں نعمت کو کچھ دن اوپر ہوگئے تھے اور وہ پچھلے دنوں سے مسی تندوری روٹی کے لیے کہہ رہی تھی۔ برکت نے کل آنگن کے ایک گوشے میں تندور لگا دیا تھا۔ لیکن صبح کے وقت جب گوندھنے کے لیے برکت نے آٹا پرات میں ڈالا تو چھوٹا لڑکا عبداللہ صحن میں گر پڑا اور وہ آٹا وہیں چھوڑ کر باہر چلی گئی۔ بعد میں جب نعمت آٹا چھاننے لگی تو اسے اس میں سے ایک دھاگا ملا جس کو کئی چھوٹی چھوٹی گانٹھیں دی گئی تھیں اور ایک گانٹھ میں تعویذ بندھا تھا۔ نعمت کو شک ہوگیا کہ برکت اُس پر جادو کر رہی ہے۔

برکت کہنے لگی: ''اور کوئی نہیں دیکھتا تو خدا تو سب دیکھتا ہے، اس کے ہاں خواہ سات بیٹے اور ہوں، مجھے کس بات کا حسد ہے، میری ایک ہی شیریں اور ایک ہی عبداللہ میرے لیے بہت ہیں۔ اور برکت آنکھوں میں آنسو بھر کر کہنے لگی: ''میرے تو گھٹنوں میں درد رہنے لگا تھا، میں مولوی صاحب سے یہ گنڈا بنوا کر لائی تھی، وہی بازو سے بندھا تھا جو کھل کر آٹے میں گر پڑا۔''

نجے ہنس سا دیا —— لیکن اُس آٹے کی روٹی تو سب نے کھائی تھی، کریم نے اُسے یہ بات نہیں سمجھائی۔

برکت کہنے لگی: ''یہی بات تو میں نے بھی کہی تھی لیکن وہ کہتی تھی کہ یہ تو مسی روٹی کا آٹا تھا،

دوسرا آٹا تو بعد میں گوندھا جانا تھا اور پھر اس بات کا امکان بھی تو ہے کہ تم بعد میں مسی روٹی نہ خود کھاتیں نہ اپنے بچوں کو کھلاتیں —— کرموں جلی یہ نہیں سوچتی کہ اگر میں نہ کھاتی تو گھر کے مرد نے تو بہرحال کھائی ہی تھی وہ بھی تو صبح سے کہہ رہا تھا کہ مسی روٹی کے ساتھ لسی ضرور بنانا اور مرد تو جیسا اُس کا ویسا میرا...

نجے برکت کو بازو سے تھام کر باہر لایا اور سب کے لیے اس کے ہاتھ سے کھانا نکلواتا، چھوٹی چھوٹی باتوں سے عبداللہ اور سلامت کو ہنساتا رہا۔

پھر اس نے مزید نصف گھنٹہ تک سلامت کو پڑھایا اور جب جانے لگا تو کریم اُسے خدا حافظ کہنے لے لیے گلی کے موڑ تک چلا آیا۔

موڑ سے ادھر جب فتے کے گھر کے آگے سے گزرنے لگا تو نجے کی نظر خود بخود فتے کے دروازے کی طرف اٹھ گئی، کہنے لگا: ''کتنا دروں بیں شخص ہے... سچ مچ دروں بیں اور توانا ہوا کرتا تھا لیکن جب سے اس کی بیٹی مری ہے، اس کی روح بھی ساتھ ہی مر گئی ہے۔'' کریم نے کہا اور بولا: ''نجے یار! روحیں سچ مچ ہوتی ہیں، کبھی کبھی فتہ بہت عجیب باتیں کیا کرتا ہے، اسے یقین ہے کہ اس کی بیٹی کی روح اسی آنگن میں رہتی ہے، کئی بار اس نے آنگن میں اس کے قدموں کی چاپ سنی ہے...

کریم اور نجے باتیں کرتے کرتے مین روڈ تک آگئے تھے لیکن کریم کو واپسی کا دھیان نہیں آ رہا تھا۔ وہ نجے کے ساتھ چلتا پوچھنے لگا: ''تم آج کل جو کچھ لکھ رہے ہو وہ بھی تو روحوں ہی کی بات ہے...''

Psychically نجے نے کہا اور مین روڈ کی طرف سے عقبی کھنڈروں کی طرف مڑ گیا۔

''کیا مطلب؟''

وہ سچ جسے خود ہی تصور میں لایا جائے اور پھر اسے خود ہی سچ سمجھ لیا جائے... خود ساختہ سچ تم جو کچھ بخار کے عالم میں بڑبڑاتے تھے، تمھیں وہ سب کچھ نظر آیا تھا؟

''جو کچھ بہت شدت سے سوچا جائے، وہ نگاہوں کے آگے بھی ظاہر ہو سکتا ہے۔ یہ دوزخ اور بہشت کا واقعی کوئی وجود ہے؟'' کریم نے پوچھا تو نجے ہنس سا دیا۔ ہاں ہے میاں! جب تمہاری شیریں آنگن میں پھول لگاتی ہے، تمہاری برکت اور نعمت ہنس کر تمہارے آگے روٹی رکھتی ہیں تو تمھیں یہی گھر بہشت لگتا ہے اور جب وہ ایک دوسری پر جادو ٹونے کا شبہ کرتی ہیں، لڑتی ہیں...

''اُس وقت دوزخ بن جاتا ہے لیکن یہ تو اور بات ہوئی...''

نجے نے سائیکل کو کھنڈروں کے ایک اونچے پتھر کے ساتھ ٹکا دیا اور ایک چھوٹے سے پتھر پر بیٹھا ہوا کہنے لگا: ''میں نے بھی کل رات اس وقت کا حال قلمبند کیا ہے۔ لیکن اس کے سارے رنگ میرے ہی خیالوں کے طلسم ہیں، اور کچھ نہیں۔''

مر کے تو آج تک کوئی لوٹا نہیں کہ وہ آ کر بتائے کہ وہاں کیا بیتتی ہے، سو یہ آدمی نے خود ہی سب کچھ کیسے بنا لیا ہے؟ کئی لوگ تو کہتے ہیں کہ انھوں نے روحوں سے مکالمات بھی کیے ہیں... کریم بڑے سکون کے ساتھ ایک پتھر پر بیٹھ گیا تھا۔

دیکھو! ہند چینی علاقوں میں تو کئی لوگ روحوں سے بیاہ بھی رچا لیتے تھے، نجے مسکرا سا دیا اور کہنے لگا: ''تم یہ بتاؤ کہ جو واقعی بچھڑ گیا ہو اور جس کے ساتھ جیون بتانے کو جی چاہتا ہو تو یہ دیوانگی کیا نہیں کروا سکتی؟''

یہ تو سچ ہے، آدمی خواہ زندہ ہی بچھڑا ہو اور خواہ مر کے، بیاہ جانے کس طرح کے ہوتے ہیں کہ ان کی جھلکیاں نیندوں میں بھی دکھائی دینے لگتی ہیں۔ لیکن یہ رفتگاں کی روحوں والی بات جو سوچی گئی ہے، اس سے ایک طرح کا سہارا تو ضرور ملتا ہے... تمھیں ایک بات بتاؤں؟ کریم نے بہت گہرا سانس لیا اور کہنے لگا: ''نعمت آج کل اُمید سے ہے...''

''ہاں مجھے بڑی اماں نے بتایا ہے۔''

''رات مجھے خواب آیا... کریم نے سر جھکا لیا اور یوں خاموش ہو گیا جیسے اپنے ہی حلق میں اپنی آواز کو ٹٹول رہا ہو...''

نجے نے دھیرے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا، لیکن کہا کچھ نہیں، کریم نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور کہنے لگا: ''جانے کتنے برسوں کے بعد ممتاز کی صورت دیکھی ہے لیکن اللہ نے صورت بھی دکھائی تو کس وقت...''

''کیوں؟''

''بس آخری سانس لے رہی تھی —— خدا جانے اس میں اس کا کون سا راز پوشیدہ ہے۔ کوئی بات بھی کی؟''

وہی بتانے لگا تھا —— بس اس نے ایک بار دیکھا اور کہنے لگی اداس کیوں ہوتے ہو؟

اب تو تمہارے گھر آؤں گی...

نجے! کریم نے کہا اور چپ ہو گیا۔

''تم کیا سوچتے ہو؟''

''کچھ نہیں۔''

''تم جو کچھ سوچ رہے ہو، میں جانتا ہوں۔''

''میں تو سوچ رہا ہوں کہ وہ جہاں بھی ہو خوش رہے۔''

اور ساتھ یہ بھی کہ وہ زندہ ہیں تو شاید تمہارے گھر... نعمت کی گود میں جنم لے گی۔ نجے نے کہا تو کریم نے بچوں کی طرح اس کے گھٹنوں پر سر رکھ دیا، صبح سے یہی سوچ رہا ہوں۔

اب تم سمجھے کہ انسان نے تناسخ کی بات کیوں سوچی تھی۔

''کیسی بات؟''

''یہی —— کہ بچھڑی ہوئی روحیں پھر جنم لے کر ملتی ہیں۔''

وہ بھی ضرور میرے جیسے ہی ہوں گے... لیکن ہم تو یار! عام سے لوگ اپنی مجبوریوں کی بنا پر ایسی بات سوچ لیتے ہیں لیکن تمہارے ہندوؤں میں تو بڑے پیغمبروں کی بات بھی یہی بتاتے ہیں کہ فلاں، فلاں کا اوتار تھا، فلاں... وہ تو ان کی اوصاف کی بنا پر یہ بات کرتے ہیں جیسے بالمیکی نے رامائن لکھی جس میں اس نے رام کو دنیا کا کامل ترین انسان کہا تھا۔ سو کیسے کہتا چنانچہ سب کچھ لکھ کر آخر میں یہ کہہ دیا کہ رام وشنو کا اوتار تھا۔ پھر جنھوں نے مہاتما بدھ کی بات کی تو انھوں نے کہا کہ بدھ رام کا اوتار تھا۔ اسی طرح جو وشنو کی بیوی تھی لکشمی وہ رام کے عہد میں سیتا بن گئی۔ اور کرشن کے عہد میں رُکمنی۔ یہ بات اوصاف کی بنیاد وضع کی ہے۔ اوصاف کئی طرح سے ہوتے ہیں۔ صرف طاقت کے بھی ہو سکتے ہیں —— ایک جزیرہ تھا، اطلانٹک، جانے کب کا غرقاب ہو چکا ہے۔ لیکن کہتے ہیں کہ جس طرح کے لوگ اس جزیرے میں آباد تھے —— اتنے طاقتور لوگ پھر کبھی نہیں ہوئے۔ وہ نسل ہی ختم ہو گئی تھی لیکن اب کہتے ہیں کہ ہٹلر اور استالین میں انہی کی روحیں تھیں۔''

نجے یہ کہہ رہا تھا کہ کریم نے بات کاٹ کر پوچھا: ''پھر تمہارا خیال ہے کہ میرا خواب یوں ہی ہے؟''

''میاں! انسان کا من بڑا جادوگر ہے —— اور کسی پر جادو نہ چلے تو اپنے آپ پر ہی چلا دیتا ہے۔'' اور نجے نے ہاتھ تھام کر کریم کو اٹھاتے ہوئے کہا: ''میں تمہارے سامنے بے ہوشی

کے عالم میں جو کچھ کہتا رہا تھا وہ کوئی سچ مچ تھا؟ سچ فقط یہی ہے کہ بیتا اب اس دنیا میں نہیں ہے سو میں نے آج تک جو کچھ پڑھ سن رکھا تھا۔ اس کے حساب سے بیتا کو دوسری دنیا میں ملنے چلا گیا... زندگی کا جادو نہیں چلا تو میں نے خود پر موت کا جادو چلا لیا۔

ایک دن کا ذکر ہے—— کریم نے فرما مشین پر چڑھا لیا تھا لیکن جب فائل پروف پر پرنٹ آرڈر پڑھنے لگا تو وہاں کچھ لکھا ہوا نہیں تھا اس لیے اس نے فرمے کی چھپائی بند کر دی۔

کل کریم کچھ علیل رہا تھا اس لیے چھٹی کے وقت اس نے مالک سے کہا تھا——

میرا بدن ٹوٹ رہا ہے اگر طبیعت زیادہ خراب ہوگئی تو شاید کل نہ آؤں، لیکن مالک نے کہا تھا، نہ میاں! چھٹی کرنی ہو تو پرسوں بے شک کر لینا۔ کل دو فرموں کا پمفلٹ ہم نے بہرحال دینا ہی ہے، کسی سفارت خانے کا ہے اور کریم آج صبح اسپرین کی پڑیا کھا کر پریس آ گیا تھا۔

اس وقت وہ بھی بے کار کھڑا تھا اور مشین بھی، مالک ابھی آیا نہیں تھا۔ وہ منیجر کے کمرے میں گیا اور بولا، دیکھو جی! اتنی عجلت مچا رکھی تھی مالک نے لیکن فرمے پر پرنٹ آرڈر لکھنا بھول گئے... ورنہ میں دوپہر کے وقفے سے پہلے دونوں فرمے چھاپ چکتا۔"

"کون سا کام ہے۔ سفارت خانے کا؟" منیجر نے کہا تو کریم کو خیال آیا لو جی بات سیدھی سی ہے، فائل میں سے ایمبیسی کا خط نکال لو، اس پر لکھا ہوگا کہ کتنی تعداد میں چھپے گا۔

کسی فائل میں، میں نے خط دیکھا تو تھا، ٹھہرو! اور منیجر فائلوں کو الٹنے پلٹنے لگا۔

تو آپ خود ہی رکھ کر بھول گئے ہیں؟ کریم نے کہا تو منیجر کے ماتھے پر شکنیں سی ابھر آئیں، میں کہاں بھولا ہوں، یہ سب تمہارے سابقہ منیجر کا کام ہے نہ کسی فائل پر نمبر درج ہے اور نہ فائلوں کا انڈیکس ہے—— مجھے تو مہینہ لگ جائے گا فائلیں تیار کرتے۔" اور منیجر نے ذرا اُکتا کر کہا: "میں تو سوچ رہا ہوں کہ جانے یہاں کام کیسے چلتا رہا ہے؟"

کریم جانتا تھا کہ منیجر نیا آیا ہے اس لیے وہ صبر سے کھڑا دیکھتا رہا۔

یہ دیکھو! کون سا کاغذ کون سی فائل میں چڑھا رکھا ہے۔ منیجر نے ایک خط نکال کر باہر رکھ دیا۔

"مل گیا ہے جناب؟"

"مل گیا..."

"کتنا آرڈر ہے؟"

منیجر نے بغور چٹھی کو پڑھا اور کہنے لگا: "اَسّی ہزار۔"

اَسّی ہزار؟ کریم ہنسنے لگا اور بولا تو پھر پہلے پیپر مارکیٹ سے کاغذ لائیے جا کر، منیجر نے حیران ہو کر کریم کی طرف دیکھا، میاں! سفارت خانوں کے کام کے لیے کاغذ سفارت خانے ہی سے ملتا ہے۔ تمہارے وطن کا معمولی سا کاغذ بھلا کبھی اُنھوں نے استعمال کیا ہے؟"

"ہاں جی، وہ تو میں جانتا ہوں۔"

"اِس وقت کتنا کاغذ پڑا ہے؟"

"دس رم۔"

"دس رم؟"

سیدھا حساب ہے جناب، ایک رم کے پانچ بڑے کاغذ، سو ایک رم میں ایک فرما ایک ہزار چھاپنا ہے، یہ دو صفحے ہیں، پانچ پانچ ہزار چھاپیں تو دس رم ہوا، لیکن آپ کہہ رہے—— اَسّی ہزار چھاپنا ہے، پھر کاغذ تو چاہیے ایک سو ساٹھ رم... باقی کاغذ نکلوا دیجیے۔

"کہاں سے؟"

"گودام میں سے اسٹاک تو وہیں ہوتا ہے۔"

لیکن اس ایمبیسی کا اسٹاک تو ہری لال کے پاس ہے... میں پہلے جس پریس میں منیجر تھا۔ مجھے یاد ہے، وہاں سارا کاغذ وہیں سے آیا کرتا تھا۔"

کریم پہلے تو خاموش رہا، پھر کہنے لگا: "ہوا کرتا تھا لیکن اس آدمی کو تو اب انھوں نے نکال دیا ہے۔"

"کیوں؟" منیجر نے کہا، لیکن مسکرا دیا، کہنے لگا: "اس نے کاغذ نکال کر بیچ دیا ہوگا؟"

"سنا تو یہی تھا جناب، رموں کے رم بیچ کر کھا گیا تھا..."

سو اب وہ کاغذ کا اسٹاک یہاں رکھے ہیں، منیجر نے کہا لیکن ساتھ ہی بولا، پھر تم رُک جاؤ، کہاں دس رم اور کہاں ایک سو ساٹھ رم، میں اس کی ذمہ داری نہیں لیتا، تم مالک کو آنے دو۔ جو آپ کی مرضی—— کریم نے کہا اور باہر جا کر نکڑ والی دکان سے چائے پینے لگا۔

کچھ دیر بعد مالک آ گیا، کریم نے پرنٹ آرڈر پوچھا اور خموشی سے دونوں فرمے پانچ پانچ

ہزار کی تعداد میں چھاپ دیے۔

ڈیڑھ بجے کھانے کے وقفے کے دوران، کریم کھانا کھا کر نل پر ہاتھ دھو رہا تھا، جس وقت نیا منیجر اس کے پاس سے گزرا اور مسکرا دیا۔

کریم مسکرایا نہیں، شاید اس لیے منیجر کو گمان گزرا کہ وہ اس کی مسکراہٹ کا مطلب نہیں سمجھا۔ ذرا قریب آ کر نل سے ہاتھ دھونے کا بہانہ بنا کر اس نے دھیرے سے کہا، میاں! آج تم نے ایک سو پچاس رم بچا دیے۔

''ہاں جی... خدا شاہد ہے۔'' کریم نے دھیمے لہجے میں کہا۔

اگر میں تمہارا کہا مان کر کاغذ نکلوا دیتا تو کاغذ کی طرح ہم بھی ضائع ہو جاتے...

کریم بولا نہیں تو منیجر نے گویا زور دے کر کہا: ''اب بولتے نہیں؟''

''میں جناب آج کل ایک کتاب لکھ رہا ہوں۔ ہدایت نامہ کارکن۔'' کریم نے کہا اور دھوئے ہوئے ہاتھوں کو جھٹکا کر چلا گیا۔

پھر کوئی چار بجے کے قریب مالک نے کریم کو بلایا اور پوچھا: ''وہ تمہارا یار آج کل کہاں رہتا ہے۔''

''منجے صاحب!''

''وہی تمہارا منجے صاحب...''

''بالکل ٹھیک ہے جناب۔''

''کوئی بڑا کام مل گیا ہے آج کل اسے؟''

''ہاں جی۔'' کریم نے کہا اور دھیرے سے مسکرا دیا، آج کل اپنا ناول لکھ رہا ہے۔''

''بڑا کام تلاش کیا ہے اس نے، مالک نے ذرا تیز آواز میں کہا اور پھر آواز کو دھیما کر کے کہنے لگا: ''کالیداس سے کم تو کوئی جنم ہی نہیں لیتا... آج کل پروفوں کا کام بہت ہے، اگرچہ اس نے چار پیسے کمانے ہیں تو...''

''اچھا جناب کہہ دوں گا...'' یہ کہہ کر کریم واپس مڑنے لگا تو مالک نے پوچھا۔

''تم کب بات کرو گے اور وہ کب آئے گا، یہاں کام رکھا ہوا ہے۔''

اور مالک نے گھنٹی بجا کر چپراسی کو بلایا اور پوچھا: ''کون سا بلاک ہے؟ سی بلاک ہے نا؟ صفدر جنگ؟''

''ہاں جی۔''

مالک نے ایک کاغذ پر ایڈریس لکھ کر چپراسی کے حوالے کیا۔

کریم واپس مڑنے لگا تو مالک نے ہاتھ کے اشارے سے اسے ٹھہرنے کے لیے کہا اور چپراسی سے کہنے لگا: ''منجے صاحب کو ساتھ ہی لے کر آنا، کہنا بہت عجلت کا کام ہے۔''

چپراسی چلا گیا تو مالک نے کریم سے پوچھا—— کیوں میاں! تمہاری نظر میں اگر کوئی ایک دو آدمی ہوں، بہت شریف، جو ٹائپ کی چوری نہ کریں، کام خواہ کم ہی جانتے ہوں یہاں ایک دو چار مہینے لگا کر سیکھ جائیں گے۔''

''اچھا جناب۔''

''سچ—— تمہارا اپنا کوئی لڑکا ہوگا۔''

''ہے جناب۔''

''کتنا بڑا ہے؟''

''چودھویں میں داخل ہو رہا ہے۔''

''تو پھر میاں! لگا دو اسے کام پر، سال بھر میں ہوشیار ہو جائے گا کیا کرتا ہے، پڑھتا ہے؟''

''ہاں جی۔''

''لیکن وہ تو تمہارا اردو پڑھتا ہوگا۔''

''اب تو ہندی پنجابی بھی اچھی طرح پڑھ لیتا ہے۔''

''پھر دیکھتے کیا ہو، لاؤ اسے کام پر۔''

کریم نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنے مشین والے کمرے میں چلا گیا۔ آج اس کا جی چاہ رہا تھا کہ دو گھنٹے کی چھٹی لے کر گھر چلا جائے گا۔ اس نے ضروری کام نمٹا لیا تھا اب تقریباً فارغ تھا لیکن یہ جان کر چپراسی منجے کو بلانے گیا ہے اس نے چھٹی نہیں لی۔

کوئی ساڑھے پانچ بجے کے قریب منجے آیا اور جب پندرہ منٹوں کے بعد مالک کے کمرے سے پروفوں کا لفافہ پکڑ کر باہر نکلا تو کریم کی طرف آیا۔ چھٹی کا وقت ہو گیا تھا سو کریم اپنی

سائیکل لے کر اس کے ہمراہ پریس سے چلا آیا۔ راستے میں کریم نے اور کچھ نہیں کہا صرف اتنا یار! آج تو تھوڑی سی پینے کو جی چاہتا ہے راستے میں کہیں سے لے لیں؟ تو سنجے نے کہا "راستے سے لینے کی ضرورت نہیں۔ گھر میں آج رم رکھی ہے۔" تو کریم پھر راستے بھر کچھ نہیں بولا۔

سنجے نے کمرے میں آکر جب دو گلاسوں میں رم انڈیلی تو اس وقت کریم بولا: "میاں! تم روز کہا کرتے تھے۔ آج کل میں بلھے شاہ نہیں گاتا اب اسے کیا گانا، اب تو میں وہاں پہنچ گیا ہوں، جہاں وہ بھی نہیں پہنچا تھا۔

سنجے نے سگریٹ سلگایا اور رم کے دو گھونٹ ایک ساتھ حلق میں اتارتے ہوئے بولا: "اچھا تو تم بلھے شاہ سے بھی اگلی منزل پر پہنچ گئے ہو۔"

"ہاں وہ تو یہی کہتا رہا—— چل بلھیا چل او تھے چلیے جتھے سارے انھے، لیکن وہ وہاں پہنچا نہیں تھا، مگر میں پہنچ گیا ہوں۔" کریم نے کہا اور ہنسنے لگا۔

تب کریم نے سنجے کو آج کی تمام سرگزشت سنائی۔ اسی ہزار کے بجائے پانچ ہزار پمفلٹ چھاپنے والا، اور کہنے لگا—— اب تم ہی کہو، آرڈر کچھ اور چھپائی کچھ اور نظر کسی کو کچھ نہیں... ہے نا اندھوں کی نگری۔"

سنجے ہنسا نہیں، کہنے لگا: "تم کیا سمجھے ہو؟"

یہی کہ اسی ہزار کے بجائے پانچ ہزار چھاپ کر سارا کاغذ بھی بچالیا اور چھپائی بھی بیس گنا وصول کرلی۔

نہیں میاں! جتنا تمہارا مالک عقلمند اور ہوشیار ہے دوسرے لوگ اس سے بھی زیادہ ہوشیار اور عقلمند ہیں۔

"تو پھر یہ بات کیا ہوئی؟"

"تیرا خیال ہے کہ ایمبیسی والوں کو اسی اور پانچ کا فرق معلوم نہیں۔"

"اگر معلوم ہے تو پھر..." کریم کو کہنے کے لیے الفاظ نہیں مل رہے تھے، صرف اتنا محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی ایسے ہیر پھیر کی بات ہے جو اس کی سمجھ میں نہیں آرہی۔

"میاں! یہ سب کچھ آپس کی رضامندی سے ہوتا ہے..."

"تمہارا مطلب ہے—— کہ انھیں بھی یہ بات معلوم ہے؟"

"بالکل۔"

"تو پھر وہ بھی شامل ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ کاغذ کے اضافی پیسے اور چھپائی اُجرت اپنی سرکار سے لے کر آپس میں بانٹ لیتے ہیں؟"

"ہاں، یہ بڑی خطرناک بات ہے..."

"اچھا۔"

"بات یہ ہے میاں کہ حکومتیں ہی حکومتوں کے لیے خطرہ بنتی ہیں۔"

"وہ کس طرح؟"

"کس بیگانے ملک کو اندر سے توڑنا ہو تو بتاؤ کہ اخراجات کے لیے پیسہ چاہیے یا نہیں؟"

"ہاں، جی وہ تو پہلی بات ہے..."

"سو یہی پہلی بات ہے کہ ہر کام ایک نمبر کے روپے سے نہیں ہوتا، اس کے لیے دو نمبر کا روپیہ چاہیے، اس طرح جو بھی روپیہ بچتا ہے۔ وہ سارا اسی کام پر لگایا جاتا ہے۔"

"ساری بات، ہمارے مالک کے علم میں ہوگی۔"

"اور کیا یوں ہی بے فکری سے اسی ہزار کی جگہ پانچ چھاپ رہا ہے؟"

"لیکن یار! یہ تو اپنے ملک سے غداری ہے۔"

"میاں! اگر لوگ وطن کے خیر خواہ ہوتے تو یہ حالت ہوتی؟"

"پھر تو یار! ہمارے اپنے لوگ ہی، اپنے گھر کو نقب لگا رہے ہیں۔"

"دوست! اگر اپنا وطن لوگوں کو اپنا گھر دکھائی دیتا، تو پھر رونا کس بات کا تھا؟ لوگ بیرونی حکومتوں سے پیسہ لے کر اپنا وطن توڑنا چاہتے ہیں۔"

"تو پھر ہمارے پہرے داران کی خبر کیوں نہیں لیتے؟ انھیں کچھ نظر نہیں آتا؟"

سنجے مسکرا دیا، کہنے لگا: "جب تم نے موت کا فرشتہ بن کر مجھے دوزخ دکھایا تھا وہاں جن کی زیارت ہوئی تھی، وہ یہی لوگ تھے۔ اور کون تھے؟ صرف اتنا فرق ہے کہ وہاں سب بے نقاب تھے سو اچھی طرح پہچان میں آگئے۔

کریم نے ایک سانس میں رم کا گلاس حلق میں انڈیل لیا اور کہنے لگا—— پھر تو یار یونہی دیوار سے سر ٹکرانے والی بات ہے۔ خود ہی سوچ سوچ کر آدمی اپنی پیشانی گھائل کرلے اور

کیا کرسکتا ہے۔

ننھے نے کریم کے گلاس میں اور رم ڈالنی چاہی تو کریم نے گلاس پر ہاتھ رکھ لیا۔

''نہیں۔'' بس آج بدن ٹوٹ رہا تھا، گھونٹ بھر پی لی اور نہیں، ابھی پانچ میل سائیکل چلانی ہے۔

اور کریم نے اٹھتے ہوئے کہا: ''ہاں سچ یہ کہو کہ سلامت کی استعداد کتنی ہوگئی ہے، کل سے اسے پریس کے کام میں لگادوں؟

ابھی اس کے لیے ہاتھ کا لکھا ہوا پڑھنا مشکل ہوگا۔ چھپا ہوا ہو یا ٹائپ ہوا ہو، تو وہ بالکل صحیح پڑھ لیتا ہے۔ اسے کام میں ڈال دو گے تو اور جلدی پڑھ لے گا۔'' ننھے نے کہا تو کریم نے بتایا کہ آج مالک نے خود ہی کہا ہے کہ لڑکے کو کام پر لگادو۔

اچھا ہے، پھر واپس لوٹتے ہوئے شام کو ہر روز میرے یہاں سے ہوتا ہوا جائے گا۔ میرا بھی وقت بچے گا اور وہ ہر روز پڑھ لے گا۔

کریم نے ذرا تاؤ کھا کر ننھے کی طرف دیکھا۔ ''تو گھر آنے کا یہ بہانہ بھی ختم ہو جائے گا۔

ننھے ہنس دیا۔ ''میاں! تمہارے لیے ہی تو کہہ رہا ہوں، اس طرح اس کے بہانے تم بھی روز آیا کرو گے، سائیکل تو ایک ہی ہے نا، اسے راستے میں اتار کر تو نہیں جایا کرو گے۔

کریم کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ ''اب پروف دیکھو گے؟ کس لیے یہ بیگار اپنے سر لے لی ہے؟''

لیکن اس بیگار کی اجرت ملتی ہے... ننھے ہنس سا دیا۔

''اپنے کام کے بہت سے صفحے رف لکھے ہوئے ہیں، کاپی کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی، وہ بالکل فالتو کام لگتا ہے، نئے سرے سے لکھنا ہو تو ان گنت صفحات لکھ سکتا ہوں۔''

''پروف ابھی دیکھو گے؟''

''نہیں کل صبح شروع کروں گا۔ رات کی روشنی میں آنکھیں ساتھ نہیں دیتیں۔''

''چلو پھر گھر چلیں کھانا ساتھ کھائیں گے۔''

ننھے منٹ بھر کے لیے خاموش رہا۔ پھر کہنے لگا ''اچھا چلو۔''

کریم نے راستے میں پاؤ بھر کلیجی خریدی اور کہنے لگا: ''آج میں اپنے ہاتھوں سے بھون کر تمھیں کھلاؤں گا۔ ایسی لذیذ پکاؤں گا کہ بڑے بڑے ہوٹلوں کو فراموش کر دو گے۔'' گھر پہنچ کر

کریم چولہے کے پاس جا بیٹھا، برکت روٹی کا انتظام کرنے لگی اور ننھے سلامت کو پڑھانے لگا۔

سلامت پڑھنے میں ہوشیار تھا، بہت روانی سے پڑھنے لگا تھا لیکن لکھنے میں اس سے غلطی ہو جاتی تھی، ننھے نے اس کی بہت سی غلطیاں درست کیں اور اس کی ہمت بندھاتا کہنے لگا: ''سلامت میاں! جلدی جلدی لکھنا سیکھو، میرا سارا ناول تم ہی نے نقل کرنا ہے۔ اور وہ میں نے تم ہی سے کروانا ہے۔''

شیریں تندور کے پاس کھڑی آنے کے پیڑے تیار کر رہی تھی۔ ہاتھ کا پیڑا ہاتھ ہی میں لیے ادھر اس چارپائی کی طرف آئی، جہاں بیٹھ کر ننھے سلامت کو پڑھا رہا تھا۔ وہ چارپائی کے پائے کے پاس کھڑی ہو کر آہستہ سے کہنے لگی: ''مجھے دے دو میں کاپی کر دوں گی۔''

''تم؟'' ننھے نے شیریں کی طرف دیکھا۔

''مجھے کہتی تھی بتانا مت، اب خود ہی کیوں بتا رہی ہو؟'' پاس بیٹھے سلامت نے کہا۔

''کیا؟'' ننھے نے پوچھا۔

شیریں بولی نہیں لیکن سلامت بول پڑا ''میں جانتا ہوں کہ اسے مجھ سے زیادہ پڑھنا لکھنا آگیا ہے، لیکن یہ مجھ سے بڑی بھی تو ہے۔''

ننھے کچھ نہ سمجھا تو سلامت نے کہا: ''بھائی جان! یہ آپ کے سامنے نہیں پڑھتی، لیکن دن بھر یہ مجھ سے پوچھ پوچھ کر پڑھتی رہتی ہے۔ آپ جو کچھ مجھے لکھ کر دے جاتے ہیں، یہ مجھ سے چھین لیتی ہے—— اس نے پوری کتاب پڑھ لی ہے۔''

شیریں نے کلائی کی اوٹ سے چہرا چھپا لیا اور تندور کی طرف چلی گئی۔ سلامت نے بتایا وہی کتاب بھائی جان! جو آپ نے لکھی ہے، ابا کے پاس پڑی تھی، اس نے ابا کی الماری میں سے نکال لی تھی۔

شیریں بڑی لگن سے اپنے کمرے میں بیٹھ کر ننھے کے ناول کی نقل تیار کرتی رہی۔ کتنا وقت بیت چکا ہے اسے کچھ احساس نہیں تھا۔ البتہ آنگن کی دھوپ کو اس کا احساس ضرور تھا جو جاتے جاتے پل بھر کے لیے کمرے کی دہلیز پر کھڑے ہو کر اسے دیکھنے لگی تھی۔

کاغذ پر، جہاں کوئی سطر کاٹ کر، پھر سے لکھی ہوئی اس کے باریک الفاظ کو پڑھتے شیریں کچھ رک سی جاتی لیکن اسے ننھے کے ہاتھ کا لکھا پڑھنے کی بہت مہارت ہوگئی تھی کہ شکستہ حروف کو

بھی اب آسانی سے سمجھ لیتی۔

آج وہ کئی صفحے نقل کر چکی تھی، جس وقت اسے محسوس ہوا—— کہ کچھ لفظوں کے خم و پیچ اس کی پوروں سے چھو کر رک گئے ہیں۔

قلم دوات ہاتھ سے ایک طرف رکھ کر——وہ کسی خیال میں گم ہو گئی۔ ہاتھ میں تھما کاغذ چار پائی پر رکھ کر کمرے کی الماری کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

ہاتھوں میں نہ عجلت تھی نہ کپکپی—— وہ پرسکون اور معمول کے مطابق تھے، جیسے ان کے لیے کچھ بھی نیا نہ ہو۔ کچھ بھی حیران کن نہیں تھا۔

الماری میں ایک مختصر سا آئینہ تھا جسے شیریں نے اٹھالیا۔ آئینے میں دیکھ کر ذرا سا مسکرائی—— اور پھر کچھ متحیر سی ہو گئی۔ جیسے اپنی ہی آنکھوں نے آج اپنے منہ پر حددرجہ جمال کا نظارہ کر لیا ہو۔

شیریں کی آنکھیں جتنی سیاہ اور بڑی بڑی تھیں، گھر میں کسی اور کی نہیں تھیں مگر اس کا چہرہ پتلا اور زرد تھا۔ اس لیے گھر میں جب بھی اس کی آنکھوں کی بات ہوتی تو منفی انداز میں ہوتی۔ جب وہ بالکل بچی تھی تو وہ نعمت کچھ کھاتے ہوئے ہر چیز کا ایک ٹکڑا اس کی ہتھیلی پر رکھ کر کہتی ”لے مر! آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھتی ہے؟“

اب بھی شیریں کا چہرہ پتلا سا تھا لیکن زرد نہیں تھا، اس کی گھنی پلکیں سیاہ ریشمی جھالر جیسی تھیں۔ جن کے رنگ سے ملتا جلتا سیاہ دوپٹہ اوڑھتی تو ایک بار تنہائی میں آئینہ ضرور دیکھتی۔ لیکن آج کی طرح نہیں۔

آج اس نے نہ سیاہ دوپٹہ اوڑھا تھا نہ اس کا دھیان آنکھوں کی طرف تھا۔ آج وہ صرف پیشانی کی طرف دیکھ رہی تھی—— جو اس کے سامنے کھڑی ہو کر دھیمے سروں میں ہنس رہی تھی۔

پھر شاید اس کی پوروں سے چھو کر ایستادہ کچھ حروف کا جادو تھا—— کہ اس نے آہستہ سے اپنی انگلی سے پیشانی کو مس کیا—— تو سامنے شیشے میں ایک سرخ اور گول بندیا اس کے ماتھے پر نظر آنے لگی۔ اور شیریں کا چہرہ نویلا ہو کر شیشے میں معلق ہو گیا۔

اپنے چہرے کی پہچان کے لیے وہ شیشے کو گھورے جا رہی تھی کہ کمرے میں کھٹکا ہوا۔ جمیلہ کمرے میں آ کر کہہ رہی تھی ”میری چپلیں نہیں مل رہی ہیں تمہاری پہن جاؤں؟ ذرا نکڑ تک

جانا ہے، اماں کہہ رہی ہیں ایک پان لا دو۔“

شیریں نے جلدی سے شیشہ الماری میں رکھ دیا اور پٹ کی اوٹ میں ہو کر دوپٹے کے پلّو سے پیشانی پونچھنے لگی۔

جمیلہ نے قریب آ کر الماری کا پٹ کھول دیا اور کہنے لگی: ”الماری میں سر چھپا کر کیا کر رہی ہو؟“

شیریں نے پھر جلدی سے ایک بار ماتھا پونچھا اور کہنے لگی: ”کچھ نہیں، ہاتھ سے سیاہی لگی ہوئی تھی شاید ماتھے پر لگ گئی، پونچھ رہی تھی۔

جمیلہ نے اس کے چہرے کا بغور جائزہ لیا، کہنے لگی: ”نہیں، کہیں بھی نہیں لگی ہوئی۔“ اور پھر شیریں کی چپل پہن کر کمرے سے نکل گئی۔

شیریں نے ایک بار پھر الماری میں سے آئینہ نکال کر دیکھا اور پھر واپس الماری میں رکھ دیا اور کچھ حیران سی ہو کر اپنی چار پائی کی طرف لوٹ آئی جہاں وہ ایک کاغذ اور قلم دوات رکھ کر گئی تھی۔

کاغذ جوں کا توں تھا۔ قلم دوات تھی لیکن شریں کو لگا—— یہی کاغذ نہ جانے کس طرح ابھی اس کے پورے دل کو مضطرب کر گیا تھا۔

اور وہ ایک ایک حرف یاد آیا... جنھیں وہ ابھی نقل کر رہی تھی۔ یہ منجھے کے ناول کا وہ حصہ تھا—— جب اس نے آسمان کی ہفت رنگ دھنک کے پاس جا کر رنگوں کو چھوا اور دیکھا تھا کہ سارے رنگ گیلے ہیں اور اس نے سرخ رنگ میں ایک انگلی ڈبو کر، دھنک پر بیٹھی بیتا کے ماتھے پر بندیا بنا دی۔

شیریں کا ہاتھ ایک بار پھر اپنی پیشانی سے ٹکرایا، اسے محسوس ہوا جیسے یہ اضطراب اس کاغذ کا پیدا کردہ نہیں بلکہ خود اس کے اندر کا طوفان ہے۔

اور شیریں کی آنکھیں بھیگ گئیں... اسے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ کس سے پوچھے کہ خود اس کے ہاتھوں اس پر کیا بیت رہی ہے۔ اس کے بعد شیریں نے سارے کاغذ سمیٹ کر الماری میں رکھ دیے اور اپنی چار پائی پر یوں لیٹ گئی جیسے بہت تھک گئی ہو۔

شام ہوتے جب کریم آیا تو برکت نے شیریں کے کمرے کی طرف اشارہ کر کے کہا: ”ذرا بچی کو تو دیکھو، مجھے تو اس کا بدن گرم لگتا ہے۔“

شیریں سو رہی تھی۔ کریم نے پیشانی پر ہاتھ رکھا، نبض ٹٹولی، ہتھیلیاں دیکھیں اور کہنے لگا: ''ہلکا سا بخار لگتا ہے لیکن زیادہ نہیں، ذرا سے بھاری کپڑے سے ڈھانپ دو، صبح تک ٹھیک ہو جائے گی۔

اور کریم نے شیریں کے پاس سے اٹھتے ہوئے پھر ایک بار اس کی پیشانی پر اپنی ہتھیلی رکھی اور اسے ذرا جھنجھوڑ کر پوچھنے لگا: ''بیٹے! کچھ پینے کو جی چاہتا ہے، چائے کا پیالہ بنا دوں!''

شیریں نے آنکھیں کھولیں۔ پانی مانگا اور پھر پانی پی کر سرہانے پر سر ٹکاتی ہوئی آہستہ سے پوچھنے لگی: ''ابا! صرف ہندو لڑکیاں ہی ماتھے پر بندیا لگاتی ہیں نا!''

''ہاں صرف ہندو لڑکیاں...'' کریم نے کہا اور بڑی تشویش کے ساتھ شیریں کی طرف دیکھتا ہوا پوچھنے لگا: ''کوئی خواب دیکھ رہی تھیں؟''

''نہیں۔'' شیریں نے اپنا منہ دوسری طرف کر لیا اور کہا اس ناول میں لکھا تھا، پوچھ لیا۔

موسم سرما کی خنکی کے ساتھ ٹھٹھرتے ہوئے اعضا کی یخ بستگی ٹوٹ چکی تھی۔ لیکن آج دوپہر سے بہت گھنے بادل سروں پر گیلے خیمے کی طرح تنے ہوئے تھے۔ اور شام، شام سے پہلے ہی آنگن میں اتر کر شیریں کے کمرے کی کھلی کھڑکی سے گزر کر اس کی چارپائی پر آ بیٹھی تھی۔

چارپائی کے پاس اسٹول پر ہجے کے ناول والے وہ سارے کاغذ چپ چاپ پڑے ہوئے تھے جن کی کاپی کرتے ہوئے شیریں نہ جانے کس وقت اُکتا کر چارپائی پر لیٹ گئی تھی اور کاغذ کے کتنے ہی الفاظ اس کی آنکھوں میں اونگھنے لگے تھے۔ اسے محسوس ہوا —— ایک بادل آسمان سے اتر کر اس کی پیشانی پر آ بیٹھا ہے۔

ایک گیلی سی یخ بستگی کے ساتھ شیریں کا سارا بدن سمٹ کر رہ گیا۔

پھر جانے کس وقت اس کا اونگھتا ہوا ہاتھ اپنی پیشانی پر سے بالوں کو ایک طرف ہٹانے لگا۔

شاید اس کی ڈھیلی ڈھالی چوٹی میں سے نکل کر بالوں کی ایک لٹ اس کے ماتھے پر آ گری تھی، جو اس کے ہاتھ کی جنبش سے پیشانی سے دور ہٹ گئی تو شیریں کو محسوس ہوا کہ اس کے ماتھے پر اُمڈے ہوئے بادل پھر لوٹ کر ہوا میں تیرنے لگے ہیں۔

بادل دور ہٹتے ہٹتے پتلے سے دھوئیں کی طرح پھیل گئے اور شیریں کو احساس ہوا —— ایک بہت خنک سی باس اس کے حلق میں اتر رہی ہے...

شیریں کی سانسیں اس کے سینے میں اور بھی مختصر اور بوجھل ہو گئیں، شاید دھواں بھی نہیں تھا، باس بھی نہیں، صرف یوں جیسے سانس لینے کے لیے آسمان میں ہوا نا پید ہو گئی ہو۔

اور پھر جیسے اس کے تمام اعضا پر بے ہوشی طاری ہو گئی ہو۔ شاید اس کی اونگھتی ہوئی آنکھوں میں نیند کچھ اور بھی گہری ہو گئی تھی۔

جانے کس وقت آنکھوں کے آگے تنے اندھیرے میں کئی رنگوں کی دھاریاں ابھر آئیں اور شیریں نے ایک بہت لمبی اور بوجھل سانس لے کر اپنے ژولیدہ اعضا کو چارپائی پر نہایت سہولت سے پھیلا دیا۔

رنگوں کی دھاریاں اور گہری ہو گئیں۔ بہت قریب، شیریں کو یوں محسوس ہوا —— وہ اپنے ہاتھ سے ان کو چھو سکتی ہے۔

ایک پر سکون سی ہوا اس کی سانسوں میں ہمکنے لگی اور اس نے رنگوں کی دھاریوں کو گرفت میں لینے کے لیے اپنا ہاتھ بلند کیا۔

دھاریاں شاید صرف رنگوں کی ہی نہیں تھیں —— ایک انتہائی ریشم گوں رسی اس کے ہاتھ سے چھو گئی۔

ہاتھ کو لمس کا احساس ہوا لیکن گرفت میں کچھ نہ آ سکا، جیسے ایک سخت لیکن ریشمی رسی اس کے ہاتھ سے پھسل گئی ہو۔

اس نے پھر رنگوں کی لکیروں کی طرف دیکھا —— وہ اب کچھ دور ہٹ گئی تھیں اور اوپر بھی جہاں ہاتھ نہیں پہنچ سکتا تھا۔

اور شیریں کو لگا —— وہ بہت زور لگا کر ایڑیاں اٹھا کر ہاتھ بلند کر رہی ہے اور پھر اس کا پاؤں بالکل مڑ گیا تھا۔

پاؤں میں موچ آنے کے درد کے احساس سے وہ ہڑبڑا کر جاگ اٹھی...

دیکھا —— پائنتی کی جانب کھڑی اماں اس کے پاؤں کو ہلا کر اسے جگا رہی تھی، یہ کون سا وقت ہے سونے کا، سرمائی دنوں میں دن کے وقت سوئیں تو پورا بدن اکڑ جاتا ہے۔

شیریں نے نیم باز آنکھوں سے اونگھتے ہوئے چاروں طرف دیکھا —— اور اپنے بدن پر پڑی گرم اوڑھنی کو بھی، اماں کہہ رہی تھی۔ سونا تھا تو کوئی بھاری کپڑا تان لیتی۔ ٹھنڈ سے سکڑی ہوئی

ہو، میں نے یہ گرم شال ڈال دی تھی... اور اماں کمرے سے نکلتے ہوئے کہہ رہی تھی: "اٹھ! نعمت کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، تم آٹا گوندھو، میں مٹروں میں ڈالنے کے لیے آلو لے آؤں، ختم ہو گئے ہیں...

شیریں نے شال کو ایک طرف ڈالا۔ چارپائی سے اٹھی تو اس کی نظر اسٹول کی طرف چلی گئی جہاں وہ کاغذ دھرے تھے جن پر بنجے کے ناول کو نقل کرتے ہوئے وہ جانے کس وقت سو گئی تھی اور وہ حیران سی ہو کر ان کاغذوں کی طرف دیکھنے لگی۔ یاد آیا —— کہ جس صفحے کو لکھتے لکھتے وہ سو گئی تھی اس میں بنجے نے اس ہفت رنگ کمان کی تفصیل بیان کی تھی —— جس پر اس نے بیتا کو بیٹھے دیکھا تھا۔

شیریں کو اپنا رنگوں کی لکیروں والا خواب یاد آ گیا —— لکیریں بالکل ویسی تھیں جیسی آسمان پر پھولنے والی دھنک کی ہوتی ہیں۔

کھڑکی میں سے در آتی شام کی خنکی ہڈیوں میں اتر گئی —— لیکن اسی کمان پر بنجے کی بیتا بیٹھی ہے۔ میں اسے ہاتھوں سے تھامنے کی کوشش کیوں کر رہی تھی؟ یہ بھی یاد آیا کہ ان لکیروں کو پکڑتے ہوئے محسوس ہوا تھا جیسے ایک سخت ریشمیں رسّی بیچ بیچ اس کے ہاتھ سے چھو گئی ہو۔

شیریں نے خود ہی اپنے آپ کو دلیل دی —— شاید اس بات کا خیال آ گیا تھا۔ جب کم سنی میں درخت کی شاخوں سے رسّی باندھ کر ہم اور جمیلہ جھولا ڈالا کرتی تھیں۔

لیکن شیریں کے دل کو اطمینان نہیں ہوا۔ "میں ریشمیں رسّی کے جھولے کو ہاتھ سے تھامنے لگی تو جھولا اُدھر سرک گیا تھا...

دل نے کہا۔ "شاید اسے بیتا نے اوپر کھینچ لیا ہو۔"

اور شیریں اسٹول پر رکھے تمام کاغذ کو سمیٹ کر الماری میں رکھنے کے بعد جب باہر جا کر پرات میں آٹا چھاننے لگی تو چھلنی اس کے ہاتھ میں کپکپا رہی تھی۔

آج اتوار تھا۔ بنجے کریم کے گھر جاتے ہوئے جب فتّے کے دروازے سے گزرا تو اس کی نظر دھیرے سے فتّے کے گھر کی طرف چلی گئی۔ دروازہ کھلا تھا۔ لیکن وہ کھلے آنگن یا کھلے دروازے کے بیچ کہیں دکھائی نہیں دیا اس لیے بنجے کریم کے گھر کی طرف نکلتا چلا گیا۔

دیکھا کہ سامنے کریم اور فتّہ دونوں اسی طرف چلے آ رہے ہیں۔ فتّے نے بنجے کو دیکھتے ہی سلام کیا اور کہا: "لو یہ تو میرا اعزت بیگ آ رہا ہے۔"

بنجے ہنس دیا۔ "تو تم اس وقت کریم لالہ کو ساتھ لے کر کہاں چلے ہو میاں؟"

فتّے نے ہاتھ سے اپنے گھر کی طرف اشارہ کیا۔ بنجے ان کے ساتھ پھر دو قدم پیچھے چل دیا۔ فتّے کے گھر کی طرف۔

تینوں آنگن میں آئے تو کریم نے دیوار کے ساتھ لگی چارپائی بچھاتے ہوئے کہا: "آج نعمت کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں، اس لیے دائی کو بلوا کر لایا تھا...

بنجے نے کریم کے کان کے پاس منہ لا کر کہا: "آج پھر تمہاری ممتاز نے آنا ہے؟"

کریم جواب میں ہنس دیا۔ "تمھیں یاد ہے وہ بات؟ لیکن ابھی نہیں، ویسے ہی شاید نعمت کا پاؤں کہیں اونچی نیچی جگہ پر پڑ گیا تھا۔ اس لیے دائی کو بلوایا ہے، ابھی تو کافی دن باقی ہیں۔"

فتّے نے کریم کے لیے حقہ بھرا اور بنجے سے کہنے لگا: "بنجے میاں! کیا خدمت کروں، چائے بناؤں!"

دوست! تم بنجے میاں کو عزت کہہ کر عزت بخش دیتے ہو، اب اور کون سا اعزاز باقی رہ گیا ہے؟ بنجے نے کہا اور اس کے چاک کی طرف دیکھتا کہنے لگا: "تم جس دن چاک پر برتن چڑھاؤ، میرا جی چاہتا ہے وہ پورا دن تمہارے پاس بیٹھ کر صراحیوں کی گردنیں ڈھلتے دیکھا کروں۔"

بس اب چاک کے دن آنے والے ہیں۔ سرمائی دنوں میں کام ذرا ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ پچھلے دنوں پیالے اور مرتبان اتارے تھے۔ ابھی وہ بھی آوے میں نہیں چڑھائے۔ فتّہ کہہ رہا تھا دفعتاً بنجے کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ کہنے لگا: "میاں! پیالوں پر پھول بوٹے بنا لو نا؟"

فتّے نے دائیں ہاتھ کو اس طرح ہوا میں لہرایا جیسے پھول بوٹوں والی بات کب سے ہوا میں گم ہو چکی ہو، کہنے لگا: "اگر تم کہو تو تمہارے لیے میں کچھ پیالوں پر پھول بوٹے بنا دوں۔"

بنجے کچھ خاموش سا رہ گیا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" کریم نے پوچھا تو درد کی اک شکن بنجے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بن کر رک گئی۔ کہنے لگا: "جن علاقوں میں بارشیں بہت کم ہوئی ہیں سال بھر میں صرف ایک بار بہت انتظار کے بعد چھینٹے پڑتے ہیں، وہاں لوگ اپنے بچوں کی عمر بارشوں سے گنتے ہیں۔ فلاں کی عمر پانچ بارشیں، فلاں کی عمر سات بارشیں، فلاں کی عمر بارہ بارشیں... سوچ رہا تھا —— ہر جگہ آدمی کی عمر کچھ اسی طرح شمار میں آتی ہے...

کریم بڑے غور سے بنجے کے منہ کو تکنے لگا تو بنجے نے کہا: ''اگر سوچیں تو ہماری سب کی عمریں اسی حساب سے شمار ہونی چاہئیں جیسے کریم میاں! تمہاری عمر ایک ممتاز، میری عمر ایک بیتا اور فتّے کی عمر ایک سلمٰی۔''

کریم نے حقّے کا ایک بھرپور کش لگایا اور کہنے لگا: ''بات تو کچھ ایسی ہوتی ہے، جس کی روح جہاں جڑ جائے۔ وہ خواہ عشق کا معاملہ ہو یا خون کے رشتے کا...''

بنجے نے اپنے بیان کے درد سے چھٹکارا پانے کے لیے فتّے کی طرف نظر ڈالی۔ اچھا میاں! جس دن آ واچڑ ھاؤ گے، میں تمہارے پاس بیٹھ کر تمہارے پیالوں پر بیل بناؤں گا۔ فتّے کے چہرے پر توانائی کا ایک موسم آ کر گزر گیا لیکن کریم ابھی اسی سوچ میں گم تھا۔ کہنے لگا: ''یہ بات بھی درست ہے لیکن ایک اور بات کا بھی تو امکان ہے۔''

''کیا؟'' بنجے نے پوچھا۔

''جو تم جیسے ذہین لوگ ہوتے ہیں —— ان کا کسب اور آمدنی بھی تو ان کا عشق ہوتا ہے۔ انھیں تو اپنی عمر اس طرح شمار کرنی چاہیے —— کہ فلاں کی عمر تین ناول، فلاں کی پانچ تصویریں، فلاں کی...''

بنجے بیچ میں بول پڑا۔ ''پھر تو تمہاری چار تصویریں ہو چکی اب پانچویں تصویر ہونے والی ہے۔''

''کون سی تصویریں، میں کوئی مصور ہوں؟ میں تو ادیبوں کی طرح مصوری کی بات کر رہا ہوں۔'' بنجے ہنسنے لگا۔ ''ایک تمہاری شیریں، ایک جمیلہ، ایک سلامت اور ایک عبداللہ...''

ماں باپ تو سب سے بڑے مصور ہوتے ہیں۔ بھئی دیکھو! کیسی تصویریں تراشتے ہیں۔ کریم کو بنجے کی بات سے دل لگی سوجھ گئی۔ کہنے لگا: ''نہیں یار! ہمارے مذہب میں بت پرستی نہیں چل سکتی۔''

''اچھا...'' بنجے نے کریم کے کندھے پر زور سے ہاتھ مارا۔ ''تو یہ بت پرستی والی بات تمھیں اب سوجھی ہے؟ ممتاز کے نام پر نہیں سوجھی تھی...''

کریم کی دلیل پھیکی پڑ گئی اور کہنے لگا —— ''کوئی عام سا آدمی ہو تو اُس سے میں پورا اتر لوں، لیکن خدا سے مقابلہ کرے، اور وہ فتّے کی طرف منہ کر کے کہنے لگا: ''یار! وہ ادیب بھی زمین

کے خدا ہوتے ہیں... قلم تھاما اور اپنے افسانے میں دوسروں کی تقدیر کو اپنے ہاتھ سے قلم بند کر دیا۔''

بنجے نے ہنس کر کریم کی طرف دیکھا اور سگریٹ سلگائی۔ فتّے کو صرف باتیں کرنا اور بنجے کی تواضع نہ کرنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ کہنے لگا —— ''میاں! بہت اچھی دکان ہے، روٹی اور کباب لے آؤں۔''

''پرہیز؟'' بنجے نے کہا تو فتّہ خود ہی کہنے لگا —— ''یوں تو مجھے معلوم ہے تو کریم کے گھر کا ریندھا پکا کھا لیتے ہو۔ پھر بھی میں نے کہا پوچھ لینا چاہیے۔''

فتّہ اٹھ کر جانے لگا تو بنجے نے اسے روک دیا —— ''آج نہیں میاں، ابھی چائے کے ساتھ روٹی اور انڈے کھا کے آیا ہوں، پھر کبھی کسی دن۔''

فتّہ پھر سے بیٹھ گیا لیکن پوچھنے لگا: ''تم نے میاں، شروع ہی سے کریم کے ہاتھ کے کھانے کے پرہیز کو تسلیم نہیں کیا تھا؟''

''یہ تو کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔'' بنجے نے کہا تو فتّہ بولا: ''یہ تو میں نے تمھیں ہی اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور نہ کسی کو دیکھا ہے نہ سنا ہے۔ لیکن تم ادیب ہو —— شودر اور برہمن والی بات شروع سے ہی چلی آتی ہے کیا؟ بھلا جب زمین —— پر نوع انسان کی ابتدا ہوئی ہوگی تو کس نے بتایا ہوگا کہ فلاں آدمی شودر ہے اور فلاں برہمن۔''

کریم کہنے لگا: ''میں تمھیں بتاتا ہوں فتّے! یہ بات ابتدا میں بالکل نہیں تھی، یہ تو بعد کے تجربوں کا نچوڑ ہے۔ جس طرح شکلیں علاحدہ علاحدہ ہوتی ہیں اسی طرح آدمیوں کی عقلیں بھی علاحدہ علاحدہ ہوتی ہیں۔ جو لوگ ذہین تھے پڑھائی لکھائی پر توجہ دیتے تھے وہ برہمن ہو گئے۔ جو مضبوط ڈیل ڈول کے لوگ تھے دشمن سے لڑ سکتے تھے وہ کھتری ہو گئے۔ جن کی طبیعتیں کاروبار کی طرف مائل تھیں... کیوں میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟'' کریم نے بنجے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

بنجے نے اثبات میں سر ہلا دیا اور کہا: ''وہ ویش ہو گئے جو بیوپار کرتے تھے۔''

اور کریم کہنے لگا —— ''جو معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والے تھے اور اپنی عقل سے کوئی کام نہیں کر سکتے تھے، وہ چھوٹے چھوٹے محنت کے کام کرنے لگے اور شودر کہلائے، خدمت گار۔ بات بس یہیں سے شروع ہوئی تھی۔''

''نہیں میاں! یہ بات بھی بعد میں بنی۔'' بنجے نے ایک اور سگریٹ سلگائی اور کہنے لگا۔

"اصل میں ایک ہی آدمی پہلے شودر ہوا کرتا تھا، پھر ویش، پھر کھتری اور پھر برہمن۔"

"کیا مطلب؟" کریم اور رفیقہ حیران ہو کر بنجے کی طرف دیکھنے لگے۔

"یہی کہ آدمی جب پیدا ہوتا ہے تو شودر ہوتا ہے۔" بنجے نے کہا تو کریم بول پڑا "برہمن کے گھر میں بھی شودر جنم لیتا ہے، یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟"

"ہاں میاں!" بنجے نے ہنس کر کریم کی طرف دیکھا۔ "برہمن کا بچہ بھی شودر ہوتا ہے۔ اصل میں بچہ جب بچہ ہوتا ہے۔ ماں باپ کا حکم مان کر چلتا ہے تو وہ شودر ہوتا ہے۔ پھر کچھ تعلیم و تربیت پا کر جب وہ کام کاج میں لگ جاتا ہے تو ویش ہوتا ہے۔ پھر جب اپنے ملک کی حفاظت کے لیے لڑتا ہے تو کھتری ہوتا ہے اور سن رسیدگی کے عالم میں —— جب زندگی کا علم و فضل اُسے حاصل ہو چکتا ہے تو وہ برہمن بن جاتا ہے۔"

"اچھا یار! بات تو سمجھنے والی ہے لیکن کہیں آج تک سنی نہیں تھی۔" کریم نے حقے کا ایک طویل کش لیا اور حیران ہو کر بنجے کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔

"یہ چاروں حالتیں ایک ہی آدمی کی ہوتی ہیں۔" اس کی عمر کے مطابق۔ بات اصل میں یہیں سے شروع ہوئی تھی۔ لیکن پھر بگڑتی بگڑتی ایسی خراب ہوئی کہ آج تک درست نہیں ہو سکی۔"

کریم نے حقہ ایک طرف رکھ دیا اور دل میں بنجے کی توقیر اور بھی فزوں ہو گئی۔ چار پائی سے اٹھتا کہنے لگا —— چلو اٹھو، گھر چلیں۔"

"لیکن وہاں بنجے..." بنجے نے کہا تو کریم بولا: "وہ وائی کچھ دیر کے لیے اس کی مٹھی چاپی کر رہی تھی۔ اس لیے میں تھوڑی دیر یہاں رک گیا۔ وہ تو بہت دیر پہلے چلی گئی ہو گی۔ آؤ چلیں۔"

اور بنجے اٹھ کر کریم کے ساتھ چل دیا۔

ایک دن دیوار کے ساتھ بندھی لمبی رسّی پر کریم دُھلے ہوئے کپڑے سوکھنے کے لیے ڈال رہا تھا۔ جس وقت بنجے نے اپنی سائیکل دروازے کے پاس رکھی اور کریم کی طرف دیکھتا ہنسنے لگا میں نے کہا —— "گھر تو کریم ہی کا لگتا ہے لیکن یہ ننگا فقیر کہاں سے آ گیا؟"

کریم کمر میں مختصر سا تہمد باندھے تھا لیکن اوپر قمیص نہیں تھی۔ ہاتھ کے کپڑے جھٹکتا اور رسّی پر ڈالتا کہنے لگا: "کبھی کبھی یار فقیروں کے دل میں بھی محبت جاگ پڑتی ہے، میں نے چاہا، آج

حسنِ اتفاق سے چھٹی ہے، ان فقیر زادیوں کے کام میں ہاتھ بٹا دوں۔"

بنجے... خود ہی ایک کمرے سے چار پائی گھسیٹ کر آنگن میں ڈالتا اور بیٹھتا کہنے لگا: "تمھیں تو میاں ادیب ہونا چاہیے تھا۔"

"چاہیے تو تھا۔" کریم اپنے تہمد کے ساتھ گیلے ہاتھ پونچھتا چار پائی کے کنارے آ کر بیٹھ گیا اور بولا: "یار تمھیں ایک بار بتایا تو تھا کہ جب جوان تھا یہی جی کرتا تھا کہ بلھے شاہ کی طرح فقیر ہو جاؤ، شعر کہتا رہوں اور گاتا رہوں... اور دنیا کی کوئی فکر نہ ہو۔ لیکن آج تم نے کیسے کہا کہ مجھے ادیب ہونا چاہیے تھا؟"

اس لیے کہ تم بہت نئے نئے لفظ گھڑتے ہو۔ امیر زادیاں تو سن رکھا تھا لیکن فقیر زادیاں تم سے ہی سن رہا ہوں۔ لیکن آج تمھیں چھٹی کیسی ہے؟ میرا خیال تھا کہ تم گھر پر نہیں ہو گے، میں تو شیریں سے ناول کا نقل شدہ مسودہ لینے آیا ہوں..." بنجے نے کہا اور اس کی نظر اُدھر اٹھ گئی کھرے میں برکت اور جمیلہ میلے کپڑے دھو رہی تھیں اور کپڑوں کو پٹخ بھی رہی تھیں۔

جمیلہ اسے دیکھ کر ہنسنے لگی اور بولی: "اماں! ذرا چھنچھی بند کر دو، بہت آواز آتی ہے۔ اب بھائی جان اور ابا علم کی باتیں کریں گے ذرا ہمیں بھی سننے دو۔"

بنجے مسکرا دیا، لیکن کریم کا دھیان ادھر نہیں تھا۔ کہنے لگا: "آج ہندوؤں کے کسی پیر کا دن ہے۔ اس کی چھٹی تھی، ویسے میں سوچ رہا تھا —— کہ کھانے کے بعد گھر سے نکلوں گا، ایک اور کام بھی تھا، پھر تمہارے ہاں بھی جانا تھا۔"

بنجے نے جمیلہ کی طرف دیکھا۔ "ہمشیرہ جان! علم کی باتیں بعد میں سننا، پہلے اٹھ کر چائے بناؤ۔"

جمیلہ دوپٹے سے گیلے ہاتھ پونچھتی اٹھ کر چائے بنانے چلی گئی تو بنجے کریم سے کہنے لگا: "یار! ایک بات بن رہی ہے اس لیے اب تک ناول کے جتنے صفحے نقل ہو چکے ہیں، وہ لینے آیا ہوں۔"

"کوئی چھاپنے پر تیار ہے!" جلدی سے پوچھا۔

"اپنی زبان میں تو نہیں لیکن لگتا ہے انگریزی میں چھپ جائے گا۔ کل شام ایک شخص سے بات ہوئی میں نے اس کا پلاٹ سنایا تھا۔ کہنے لگا: "میں اسے انگریزی میں منتقل کروں اور یہ بھی

ممکن ہے کہ کسی بیرونی ملک میں چھپ جائے...'' بنّے کی بات سن کر کریم کے چہرے پر ایک شکن ابھری۔ کہنے لگا: ''پھر لعنت ہے اپنی زبان والوں پر۔''

بنّے مسکرا دیا۔ ''یار لعنتیں تو خدا نے شاید اسے عمر بھر دی ہیں، ہم اس کے لیے کیوں وقت برباد کریں، بہت کام پڑا ہوا ہے... کہاں ہے شیریں، دیکھوں کتنے صفحے ہوگئے ہیں؟''

کریم اٹھ کر شیریں کے کمرے کی طرف گیا اور واپس آ کر کہنے لگا: ''دیکھو اٹھ کر منظر دیدنی ہے، وہ رات بھر یہی کام کرتی رہی ہے۔ نصف شب کو بھی میں نے لیمپ روشن دیکھا تھا۔ صبح بھی اور اب اس کے چاروں طرف کاغذ ہی کاغذ پڑے ہیں اور خود ان کے درمیان یوں سوئی پڑی ہے ــــ جیسے کاغذوں کی قبر میں پڑی ہو۔''

''کام تو میں نے سچ مچ اسے بہت مشکل دیا ہے۔'' بنّے ہنس دیا۔ ''میں خود بہت مشکل سے کاغذوں کی قبر سے نکلا تھا، اب اسے ڈال دیا ہے۔''

جمیلہ دو گلاسوں میں چائے لے آئی تھی۔ بنّے نے ایک گلاس اٹھا کر جمیلہ کو دیتے ہوئے کہا: ''چائے شیریں کو دے آؤ، شاید اس نے صبح سے چائے نہیں پی۔''

''ہائے بھائی جان! آپ نہ آتے تو اسے کون پوچھتا چائے ــــ جمیلہ زور سے ہنس دی۔ اسی کا درد ہے آپ کو، بے چاری جمیلہ کو ایک بار بھی نہیں پوچھا کہ پی لو چائے۔''

''اری پگلی! وہ رات بھر کام کرتی رہی ہے۔'' کریم نے کہا تو جمیلہ گلاس واپس بنّے کو لوٹاتی کہنے لگی: ''بے فکر ہو کر پی لیجیے بھائی جان! میں نے ابھی اسے چائے پلائی تھی سونے سے پہلے۔'' اور پھر ذرا رک کر کہنے لگی: ''آپ نے اسے تو پڑھا دیا مجھے کیوں نہیں پڑھاتے۔''

بنّے مسکرا دیا۔ ''میں نے اسے کب پڑھایا تھا؟ اس نے تو مجھ سے چوری پڑھ لیا ہے۔''

جمیلہ کچھ کہنے لگی تھی جس وقت برکت نے اسے آواز دی ــــ اری! بڑیاں ڈال چنے کی دال چڑھا دو۔ یہ کپڑے باقی رہ گئے ہیں، میں کھنگال کر آتی ہوں۔ جمیلہ چلی گئی تو کریم نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا ــــ ''میاں تم نے اس دن جو بات سنائی تھی، میں جب سے اسی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔''

''کون سی بات؟''

''وہی شودر اور برہمن والی کہ آدمی خود ہی چاروں ذاتوں میں تقسیم ہوتا ہے۔''

''ہاں میاں کسی نے بات تو بہت درست بتائی ہے۔''

''جس نے علم حاصل کر لیا، وہی برہمن ہوگیا۔''

''جسے آپ لوگ عالم فاضل کہتے ہیں۔''

لیکن یار! وہ بھی تو ہندو ہیں جو خواہ ایک سو برس جئیں برائے نام علم رکھتے ہیں، وہ تو عمر بھر شودر ہی رہے نا؟''

اصل میں مناقشت کا آغاز یہیں سے ہوا۔ کئی تو عمر بھر شودر ہی رہتے کئی عمر بھر ویش رہتے، ضروری نہیں ہوتا کہ عمر کے ساتھ علم حاصل ہو جائے۔''

''ایک حفیظ صاحب تھے، بہت مشہور آدمی۔''

''وہی جن کے انتقال کی خبر آئی تھی پچھلے دنوں۔''

''وہی، خدا اس کی روح کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے، جتنی دیر زندہ رہا۔ حکومتوں کے ڈھول پیٹتا رہا، حکومتوں نے اسے خلعتوں سے تو نوازنا ہی تھا، سو بہت نوازا گیا۔''

''ہاں میں نے اخبار میں پڑھا تھا۔''

''لیکن سچ پوچھو تو خدا نے جانور کو آدمی کی جون میں پیدا کیا تھا...''

''تم اسے جانتے تھے؟''

''نہیں یار! مجھے یہ شرف حاصل نہیں ہوا تھا، میں نے تو سب کچھ ان کے منہ سے سنا تھا جو اب اس کا ماتم کرنے میں پیش پیش ہیں۔''

بنّے ہنس سا دیا۔ ''سو ایک تو ماتم کرتے ہیں اور اوپر سے باتیں سنا رہے ہیں؟''

''یہی تو دنیاداری ہوتی ہے۔ اور میاں تم کیا دنیاداری کسی اور شے کو سمجھتے ہو؟ پرسوں خدا کی مار، میں بھی ان ہی کی سنگت میں پھنس گیا۔''

''وہ کس طرح؟''

''میرے ساتھ تو انھیں فقط اتنا ہی کام کہ انھیں کوئی اچھا کاتب نہیں مل رہا تھا، تمھیں معلوم ہے کہ اردو کا کام اب اتنا کم رہ گیا ہے کہ کاتب ہی نہیں ملتے، کاتب تو مسلمان ہی ہوا کرتے تھے، کچھ پاکستان چلے گئے، جو رہ گئے انھوں نے یہ پیشہ چھوڑ دیا۔''

''تو آج کل انھوں نے تمھیں کاتب بنا رکھا ہے؟''

"وہ تو شعبہ ہی علاحدہ ہے میاں! جس طرح کاتب لکھتے ہیں ایک ایک حرف موتیوں کی طرح، وہ بھلا کوئی دوسرا لکھ سکتا ہے؟ مجھ سے تو کہتے تھے کہ تم کوئی کاتب تلاش کر دو۔ آج اسی لیے سوچ رہا تھا کہ شہر جا کر پتہ لگاؤں، ایک پیراں دتہ ہوا کرتا تھا لیکن بہت دنوں سے اسے دیکھا نہیں۔ خدا جانے زندہ بھی ہے یا نہیں، میں نے سوچا —— اگر کسی مزدور بھائی کو کام ملتا ہے تو اچھی بات ہے..."

اور کریم نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا: "لیکن میں اور بات کہہ رہا تھا، وہاں جو نظارہ دیکھا، بس دیدنی تھا، وہ ایک تو حفیظ صاحب کی یادگار شائع کرنے کی باتیں کرتے تھے اور ساتھ ہی آپس میں وہ چٹکلے چھوڑ دیتے تھے کہ آدمی کانوں پر دونوں ہاتھ دھر لے۔"

"ساری زبانوں میں میاں! یہی ہوتا ہے، کئی اخبارات والے تو صرف کفن ہی بیچتے ہیں جو بھی مر گیا، اس کی تعریف اور تصویروں کا بنڈل چھاپ دیا۔"

"پھر تو یار! اس کے جوتے کی تصویر بھی چھاپتے ہیں کہ وہ کون سا جوتا پہنتا تھا۔"

ننھے مسکرا دیا۔ "ہاں میاں! اس دنیا میں ان کی بات کون کرتا ہے، جن کے پاؤں کی ایڑیاں زندگی کا راستہ کھوجتے گھس جاتی ہیں۔"

کریم نے ننھے کے قریب ہو کر ذرا آہستہ لہجے میں کہا: "اب وہ لکھ لکھ کر تو جانے کیا کفر تولیں گے لیکن جو کچھ وہ لکھتے نہیں اگر وہ سن لے تو جیتے جی مر جائے۔ جو کچھ لکھیں گے، وہ کفر ہی تو ہوگا۔ نرا جھوٹ لکھیں گے، جھوٹی تعریفیں۔"

اور کریم اس سے بھی دھیمی آواز میں بتانے لگا —— "کہہ رہے تھے۔ سگی بہن اور بیٹی بھی اس کے کمرے میں بٹھا دو، تو اس کی عزت بھی نہیں بچتی تھی... ایک بچی سی اس کے پاس رہنے کے لیے آئی تھی۔ اس کا باپ کہیں انگلستان میں تھا اور لڑکی نے کسی بڑے اسکول میں داخلہ لینا تھا۔ بڑے اسکولوں میں ہوسٹل ہوتے ہیں نا، اسے وہاں ابھی کمرہ نہیں ملا تھا۔ سو کچھ دن اس کے گھر میں ٹھہر گئی، تو بس میاں! کہتے ہیں ایک رات اس نے جا دبوچی۔ لڑکی چیختی چلاتی ہی رہ گئی کہ چاچا! یہ کام نہ کرو۔"

"توبہ..." ننھے کے منہ سے نکلا اور اس کی آواز اس کی پیشانی کی شریان کی طرح کھنچ گئی۔

کریم نے ماتھے پر دوہتھڑ مارا اور کہنے لگا: "کہتے تھے انجمن علم نے ایک بار ایک رسالہ

جاری کیا تھا تو اسے مدیر بنا دیا، ایک بار پریس لگایا تو اسے سارے کام کا مہتمم بھی بنا دیا جسے جی سال میں اس نے سب کچھ بیچ باچ کر جیب میں ڈال لیا اور حساب کتاب کے تمام کاغذات گم کر دیے۔"

"تو اب اس کے کون سے کارناموں کے نمبر شائع کریں گے؟"

"لو —— جھوٹ کو سچ بنانے پر کون سا زر خرچ ہوتا ہے؟ اور پھر قیمت سے بیس گنا تو وہ پہلے ہی وصول کر چکے ہیں۔" اور کریم بتانے لگا: "پہلے تو حکومت سے پیسہ ملے گا —— کتاب چھاپنے کے لیے، پھر جب اس کتاب میں لکھنے والوں کا رطب و یابس بھر چکے گا تو حکومت اس کی دس ہزار کاپیاں خریدے گی —— صدقے جائیں اس حکومت کے۔"

ننھے منٹ بھر کے لیے چپ ہو گیا۔ پھر آہستہ سے کہنے لگا: "حکومتوں کی یہی تو فضول خرچیاں ہیں جن کی بنا پر ہر سال عام آدمی پر اندھا دھند ٹیکس میں اضافہ ہو جاتا ہے۔"

"وہ تم نے دوزخ کا جو منظر دیا تھا —— کہ وہ ایک میدان میں لوگوں کا گوشت چھری سے کاٹ رہے ہیں، وہ سارا ناول میں لکھا ہے یا نہیں؟" کریم نے پوچھا ننھے مسکرانے لگا۔ "میاں اگر وہ نہیں لکھنا تھا، تو پھر ناول ہی کیوں لکھتا؟"

"وہ تم نے بالکل صحیح نظارہ دیکھا تھا کہ جو لوگ بالکل بے عقل ہوں گے، نہ کوئی کام کریں گے نہ کسی کام کے قابل ہوں گے، ان سے کوئی ٹیکس نہیں لیا جائے گا اور... جو عقل کے بل پر روزی کمائیں گے تو روٹی سے ان کے بدن میں تازہ لہو مہکے گا اور وہ پچاس فیصد لہو اور گوشت بطور ٹیکس ادا کریں گے۔"

"ہاں، اور تمھیں اس ہفتے کی بات سناؤں کہ امریکہ میں بہت سے لوگوں نے مظاہرہ کیا ہے کہ حکومت اپنے اخراجات کم کرے تاکہ لوگوں کی ٹیکس کم ہو، انھوں نے نام لے لے کر بتایا کہ کتنے آدمی ٹیکس کی ادائیگی میں ہارٹ اٹیک سے مر گئے ہیں۔"

"ہوں..." کریم کی آواز میں ذرا حدت پیدا ہو گئی —— "پھر تو تمہاری طرح اور ملکوں میں بھی لوگ اپنی آواز بلند کر رہے ہیں۔"

"لیکن میاں!" ننھے کی آواز اسی طرح خنک تھی۔ "حکومتوں کی صرف زبان ہوتی ہے کان نہیں ہوتے، ہر ملک میں یہی حال ہے۔"

"تمھیں اور بتاؤں۔" کریم کی آواز قدرے بلند ہو گئی۔ "کتاب کا بندوبست تو جو رہا

ہے وہ ہو ہی رہا ہے۔ کل انھوں نے حکومت سے اپیل کی تھی کہ حفیظ صاحب کے نام پر ایک ڈاک کا ٹکٹ بھی جاری کیا جائے۔"

نجّے کی ہنسی چھوٹ گئی —— "کیوں! کیا وہ دوزخ میں اسے خط لکھنا چاہتے ہیں؟" یہ شاید نجّے کی ہنسی کی آواز تھی جس سے اندر کمرے میں سوئی شیریں جاگ گئی اور اٹھ کر آنگن میں آ گئی۔

نجّے نے چارپائی سے اٹھ کر شیریں کو سلام کیا تو کریم ہنس دیا۔ "ارے لڑکی! تم ابھی سے شودر سے برہمن ہوتی جا رہی ہو، دیکھو نجّے صاحب تمھیں سلام کر رہے ہیں۔"

"بج یار! میں نے اس کے عمر سے زیادہ کام اسے سونپ دیا ہے... اور کام کرنے والے کو سلام کہنا ضروری ہے۔"

نجّے نے جواب دیا تو کریم شیریں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا —— "جس ناول کی تم نقل کر رہی ہو وہ انگریزی میں بھی چھپ رہا ہے۔"

شیریں نے کہا کچھ نہیں، ایک بار نجّے کی طرف دیکھا، پھر نگاہ نیچی کر لی۔

"جاؤ بیٹا! جتنے صفحے تیار ہیں اسے دے دو۔" کریم نے کہا تو شیریں پھر کمرے میں لوٹ گئی۔

کوئی منٹ بھر بعد شیریں نے کمرے کی دہلیز کے پاس آ کر کہا: "ایک بار دیکھ لیں میرا لکھا درست ہے یا نہیں؟"

شیریں کو کئی دن ہو گئے تھے نقل تیار کرتے لیکن نجّے نے پہلے صفحے کے سوا اور کوئی صفحہ نہیں دیکھا تھا۔ صرف ایک دن بتایا تھا کہ وہ ہر صفحے پر کتنا حاشیہ چھوڑ دے۔

شیریں نے وہ صفحہ دوبارہ لکھ کر بتا دیا تھا پھر اس کے بعد آج تک نہ کچھ پوچھا تھا، نہ دیکھا تھا۔

نجّے نے کمرے کی طرف جاتے ہوئے صرف اتنا کہا —— اگر مہارت حاصل کرنا ہو تو ہر حرف بہت صاف صاف پڑھا جانا چاہیے اور پھر کمرے میں جا کر کاغذوں کو نمبروار رکھتی شیریں کے ہاتھ سے کچھ کاغذ لے کر دیکھنے لگا۔

ایک سو بیس صفحے ہو بھی گئے؟ نجّے نے باقی کاغذ تھام لیے اور کچھ حیران ہو کر شیریں کی طرف دیکھنے لگا۔

"پہلے ہاتھ نہیں چلتا تھا، اب اور بھی جلدی ہو جائیں گے۔" شیریں نے کہا اور نقل کے ساتھ اصل کاغذ بھی دے دیے۔

شکریہ یا مہربانی جیسی کوئی بات کہنے کے لیے نجّے نے شیریں کی طرف دیکھا لیکن شیریں کی محبت کے آگے اسے یہ سارے الفاظ چھوٹے لگے اور وہ کہنے لگا: "سب سے پہلے تم نے ہی اس ناول کو پڑھا ہے۔ اس لیے سب سے پہلے تم ہی بتاؤ کہ کیسا لگا؟"

شیریں کی دونوں فراخ اور کالی آنکھیں پل بھر کے لیے سیدھا نجّے کے چہرے میں گڑ گئیں۔ نجّے کو اس عام سے سوال کا جواب عام سا نہیں لگا۔

پھر یہ بھی لگا —— جیسے شیریں کی آنکھوں میں کچھ امڈ آیا ہے۔ کیا؟ معلوم نہیں۔ بھول سی ہو گئی —— شاید آنسوؤں جیسا کچھ تھا، لیکن نجّے نے ایک بار پھر دیکھا، آنکھیں خشک تھیں البتہ پہلے سے کچھ زیادہ فراخ تھیں —— صرف آنکھوں میں کچھ شکایت سی تھی۔

"شکوہ! کس کا؟ نجّے اپنی ہی سوچ کی توجیہہ نہ کر سکا اور کاغذوں کو دونوں ہاتھوں میں سمیٹتا ہوا آنگن میں آ گیا۔

کریم کے گھر کے سارے کمرے اتنے مختصر تھے کہ دو دو چارپائیاں ہی ان میں بچھ سکتی تھیں وہ سبھی ایک ہی قطار میں ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے کھڑے تھے۔ ان کے دروازے آنگن کی طرف کھلتے تھے اور ایک کھڑکی بھی آنگن کی طرف تھی جس کی بنا پر گرمیوں کے دنوں میں بڑی حدت رہتی۔ برسات کے دنوں میں یا تو حبس رہتا یا پھر مینہ کی بوچھاریں سیدھی پڑتیں اور سردیوں میں شدید جاڑے سے روک تھام کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ لیکن اس گھر کا ایک سکھ یہ تھا کہ اس کا آنگن بہت کھلا تھا اور کمرے بھی بہت تھے جس میں برکت علاحدہ رہتی تھی۔ نعمت الگ۔ دونوں لڑکیوں کا کمرہ بھی علاحدہ تھا اور کریم کا اپنا علاحدہ کمرہ تھا۔ سلامت کو تنہا سونے میں ڈر لگتا تھا اس لیے وہ بھی رات کو کریم کے کمرے میں آ جایا کرتا تھا لیکن اس کا علاحدہ کمرہ ضرور تھا۔ البتہ چھوٹا عبداللہ ابھی تک ماں کے پاس سوتا تھا۔

ایک رات شیریں کے علاوہ، کسی کے کمرے کی بتی روشن نہیں تھی جب کریم نے پہلو بدلتے وقت سلامت کی چارپائی کی طرف آواز سی سنی اور نیند میں بھی اس نے آواز دی کون ہے سلامت؟

"ہاں ابا، میں پانی پینے کو اٹھا تھا۔" سلامت کی آواز آئی تو کریم پھر گہری نیند میں چلا گیا۔

سلامت نے اندھیرے میں اپنی جیب ٹٹولی، پھر دبے پاؤں شیریں کے کمرے کے پاس

جا کر اندر جھانکا۔

شیریں اپنی دھن میں لیمپ کی روشنی میں کاغذ کھولے ناول کے باقی ماندہ صفحات کی نقل تیار کر رہی تھی۔ سلامت دہلیز کے پاس ہی تھا جب اس نے جمیلہ کی آواز سنی۔ ''مجھے تو اب اس کمرے میں نیند نہیں آتی نہ تم بتی بجھاتی ہو، نہ میں سو سکتی ہوں کل سے میں سلامت والا کمرہ چھین لوں گی۔ اکیلی سو جاؤں گی۔''

شیریں نے کاغذ سے دھیان ہٹایا۔ شاید جمیلہ سے کچھ کہنے لگی تھی۔ جس دروازے کے پاس سلامت کا ہیولیٰ نظر آیا کہنے لگی: ''کون ہے سلامت؟ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''کچھ نہیں پانی پینے کو اٹھا تھا۔''

''جاؤ پھر سو جا کر۔'' شیریں نے کہا اور باقی صفحات کو دیکھنے لگی۔ شاید گننے لگی تھی۔

شیریں پھر اپنے کام میں لگ گئی تھی اور پورے دو صفحے اس نے اور لکھ لیے تھے جس وقت اسے آنگن میں ایک کھٹکا سنائی دیا۔

''کون ہے باہر؟'' شیریں نے کچھ چونک کر دروازے کی طرف دیکھا لیکن باہر اندھیرا تھا نظر کچھ نہیں آیا۔ وہ ہاتھ والے کاغذوں کو پاس رکھ کر اٹھنے لگی تھی، جس وقت سلامت چوکھٹ میں کھڑا اندر کو جھانکتا نظر آیا۔

''تم کیا کر رہے ہو یہاں؟'' شیریں نے سلامت کی طرف دیکھ کر کچھ غصے سے پوچھا تو سلامت نے ہونٹوں پر انگلیاں رکھ کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ پھر اسے اشارے سے جیسے دروازے کے پاس بلایا۔

شیریں اٹھ کر دروازے کے پاس گئی تو سلامت نے اندر کی طرف جھانکتے ہوئے آہستہ سے پوچھا کیا جمیلہ سو گئی ہے؟''

شیریں نے اندر کی طرف دیکھا، جمیلہ کی چارپائی کی طرف اور کہنے لگی: ''کیوں؟ وہ تو سو رہی ہے۔''

سلامت نے جیب میں سے ایک کاغذ نکال کر شیریں کو دے دیا۔ کہنے لگا: ''جمال نے کہا تھا: ''یہ شیریں کو اس وقت دینا جب وہ اکیلی ہو۔''

''کون جمال؟'' شیریں نے ہاتھ میں تھامے کاغذ کو ایکبارگی دیکھا اور ایک بار سلامت

کے منہ کو۔

''ساتھ کی گلی والا، پھیری والا جمال۔'' سلامت کہہ رہا تھا، جس وقت کریم کی آواز آئی: ''کون ہے باہر آنگن میں؟''

''میں ہوں ابا۔'' سلامت نے کہا اور جلدی سے ابا کے کمرے کی طرف چلا گیا۔

''تمہیں آدھی رات کو کون سی پیاس لگ گئی ہے؟'' کریم کی اونگھتی سی آواز آئی اور پھر چاروں طرف چپ چھا گئی۔

شیریں کا وہ ہاتھ کانپ گیا جس میں سلامت ایک میلا سا کاغذ تھما گیا تھا۔ کاغذ میں جانے کیا لکھا تھا لیکن شیریں کو ایک باس سی آ گئی تھی۔ جیسے اچانک ایک بڑے میلے اور کیچڑ بھرے مقام پر اس کا پاؤں جا پڑا ہو۔

شیریں ہاتھ کسمسا کر ایک بار ہوا میں یوں بلند ہوا جیسے ابھی جمال سامنے کھڑا ہو اور اس نے ایک بھرپور طمانچہ اس کے گال پر جڑ دیا ہو۔

جی چاہا زور سے چیخ اٹھے ابا! یہ دیکھا اپنے بیٹے کی کرتوت۔

لیکن ایک خوف نے اسے تھام لیا —— سبھی سوئے ہوئے جاگ پڑیں گے اور شاید سوئی ہوئی یہ بات بھی۔

وہ کانپتی ہوئی چارپائی کے کنارے بیٹھ گئی۔

وہ تڑا مڑا سا کاغذ ابھی ہاتھ ہی میں تھا۔ شیریں کو اپنے ہاتھ سے کراہیت سی آئی اور اس نے کاغذ اسٹول پر پھینک دیا۔

اسٹول پر ناول کے اصل صفحات بھی تھے اور نقل بھی اور ان صفحات پر پڑا یہ کاغذ شیریں کو دکھائی دیا —— جیسے اس دوزخ سے کسی نے یہ خط لکھ کر اُسے بھجوایا ہو، جس کا حال وہ اس وقت نقل کر رہی تھی۔

شیریں نے اس خط کو پڑھا نہیں لیکن یوں لگا جیسے اسے دیکھ کر ہی اس کا پورا جسم مر گیا ہو۔

پھیری والے جمال کو وہ جانتی نہیں تھی لیکن اتنا سن رکھا تھا کہ وہ برابر محلے کا بدمعاش کہلاتا ہے۔

جی میں آئی —— کاغذ کو پھاڑ کر پرزے اڑا دے اور باہر آنگن میں جا کر دیوار سے باہر پھینک دے لیکن ساتھ ہی اس نے جی ہی میں ایک فیصلہ کر لیا کہ صبح اسے اپنے باپ کو ضرور دکھائے

گی ورنہ جانے کل یا پرسوں سلامت اس جیسا کوئی کاغذ اس کو پکڑ دے جائے گا۔

اس کے بعد شیریں ناول کا کوئی حصہ نقل نہ کر سکی۔ وہ سرہانے پر سر رکھ کر یوں پڑی رہی، جیسے ہاتھوں کی ساری حرکت مر گئی ہو...

جانے کس وقت نیند آ گئی۔ کب دن چڑھا، کس وقت گھر کی خوابیدہ آوازیں جاگیں جب اس کی آنکھیں کھلیں تو جمیلہ اسے چائے کا گلاس دے رہی تھی۔

شیریں نے گھبرا کر جمیلہ کی طرف دیکھا۔ پھر اسٹول کی طرف اور کہنے لگی: ''ذرا ابا کو بلانا۔''

کریم کمرے میں آیا تو شیریں نے اسٹول کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''سب ختم ہو گیا؟'' کریم نے تہہ کیے ہوئے کاغذوں کی طرف دیکھا اور شیریں کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''تم شاید رات بھر لکھتی رہی ہو——''

کریم نے چارپائی کے پائے کے ساتھ رکھا چائے کا گلاس دیکھا جو ابھی جمیلہ نے وہاں رکھا تھا اور گلاس اٹھا کر شیریں کو دیتے ہوئے کہنے لگا: ''لے ذرا گرم گھونٹ لے کر تھوڑی دیر کے لیے سو جا، آج اتوار ہے، بچے ضرور آئے گا، بڑا خوش ہوگا...''

کریم کہہ رہا تھا جس وقت شیریں نے شکستہ آواز میں کہا: ''نہیں، ابا ابھی تین صفحے باقی ہیں۔'' اور اس نے مڑے تڑے کاغذ کی طرف اشارہ کیا، جو ان صفحات کے بیچ اڑسا ہوا تھا۔ کریم نے کاغذ لے لیا اور اس کی تہہ کھولتا پوچھنے لگا: ''یہ کیا ہے؟''

میں نے نہیں پڑھا شیریں نے کہا تو کریم کی ٹیڑھی میڑھی سطروں کو دیکھتا اندازے سے پڑھنے لگا: ''ظالم لوگ ہیں شیریں تیرے شہر کے... اپنے بھیگے ہوئے رخسار میرے جلتے ہوئے ہونٹ پہ رکھ دے...''

کریم کے ہاتھ کو جیسے کسی نے ڈس لیا تھا۔ وہ عجلت میں چارپائی کے کنارے بیٹھتا پوچھنے لگا۔

''یہ تمہیں کس نے دیا ہے؟''

''سلامت نے؟''

''سلامت نے؟'' کریم نے حیرانی سے کہا اور پھر کاغذ کی طرف دیکھنے لگا—— جس کے ایک گوشے میں لکھا تھا: ''تیرا دیوانہ جمال۔''

کریم کچھ دیر کے لیے بالکل چپ ہو گیا پھر کہنے لگا: ''یہ سلامت لایا تھا، کب؟''

''رات...''

کریم کو رات کی بات یاد آ گئی، جب اس نے دو بار کھنکاس کر آواز دی تھی اور سلامت نے کہا تھا ''وہ پانی پینے کے لیے اٹھا تھا۔''

کریم چارپائی سے اٹھتا پوچھنے لگا: ''اس سے پہلے بھی سلامت نے کبھی اس کا کوئی خط دیا ہے؟''

''نہیں...'' شیریں نے کہا تو کریم اس کاغذ کو مٹھی میں بھینچتا باہر چلا گیا۔

اس نے آنگن میں نل سے پانی بھرتی جمیلہ کو دیکھا۔ پھر رسوئی میں آٹا گوندھتی برکت کو، پھر نعمت کے کمرے کے بند کواڑوں کو اور پھر سلامت کو، جسے جمیلہ نے بھری ہوئی بالٹی اندر لا کر رکھنے کے لیے آواز دی تھی۔

کریم نے نل کی طرف جاتے سلامت کے بازو کو تھام لیا اور کھینچتا ہوا اپنے کمرے میں جا کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

بند دروازے سے جب سلامت کی چنگھاڑوں کی آواز آئی تو برکت آٹے سے بھرے ہاتھوں کے ساتھ ہی باہر آ کر جمیلہ سے پوچھنے لگی: ''ابھی تو وہ تمہارے پاس کھڑا تھا، کیا بات ہو گئی؟''

''معلوم نہیں...'' جمیلہ نے کہا اور بالٹی اٹھانے کے لیے نل کی ٹونٹی کو بند کرتی، ٹونٹی پر ہاتھ رکھ کر ابا کے کمرے کی طرف دیکھنے لگی۔

سلامت کی آوازیں اور بھی بلند ہو گئی تھیں، ساتھ ہی ایسی آواز آئی جیسے اس کا سر دروازے سے ٹکرایا ہو۔

نعمت بھی اپنی چارپائی سے اٹھتی، بہت وقت سے دروازے میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ اور برکت کریم کے دروازے کی طرف جاتی کہنے لگی: ''ارے اب بس کرو، مار ہی ڈالو گے بچے کو۔''

برکت نے آٹے والے ہاتھ سے ہی بڑی زور سے دروازہ کھٹکھٹایا، لیکن کریم نے نہ تو اندر سے کوئی آواز ہی دی اور نہ دروازہ کھولا۔

سلامت کی چنگھاڑیں جب لمبی لمبی ہوکوں میں بدل گئیں تو کریم نے دروازہ کھول دیا، لیکن بتایا کچھ نہیں۔ صرف بلند آواز میں کہا: ''تم سب میرے سر پر کیوں آ کھڑی ہوئی ہو، جاؤ اپنا اپنا کام کرو۔''

نعمت نے ایک بار تیوری پر بل ڈال کر کریم کو دیکھا، پھر چپ چاپ اپنا دروازہ بند کر کے

چار پائی پر لیٹ گئی۔

جمیلہ پانی کی بالٹی اٹھا کر اندر باورچی خانے میں لے گئی اور پھر باہر نہیں آئی۔

صرف برکت نے قیاس لگایا کہ شیریں آواز سن کر بھی اپنے کمرے سے باہر نہیں آئی۔ اسے ضرور علم ہوگا کہ کیا بات ہے۔ اس لیے وہ آہستہ سے شیریں کے پاس جا کر پوچھنے لگی: ''اری، تم جانتی ہو، کیا بات ہے؟''

شیریں نے جواب نہیں دیا نہ ہی ماں کی طرف دیکھا۔ صرف برکت نے دیکھا شیریں سرہانے پر سر رکھے چپ چاپ رو رہی ہے۔

برکت چار پائی کے کنارے بیٹھتی شیریں کو بار بار پوچھنے لگی، تو شیریں نے آہستہ سے کہا: ''تم خود ہی کچھ دیر بعد ابا سے پوچھ لینا۔''

اس کے بعد کسی میں ہمت نہیں ہوئی کہ وہ کریم سے کچھ پوچھتا، صرف جب نعمت نے روٹی کے وقت روٹی کھانے سے انکار کیا تو کریم نے روٹی کی تھالی خود ہی تھام لی اور نعمت کے کمرے میں جا کر روٹی اس کے آگے رکھتے ہوئے کہا: ''آج تو خوشی سے تمھیں دوگنی روٹی کھانی چاہیے تھی —— کل تمہارے بیٹے نے پانچ روپے کمائے ہیں۔''

نعمت نے کریم کی آواز میں چھپے طنز کے نشتر کو بھانپ لیا اس لیے کہا کچھ نہیں۔ کریم نے ہی کہا: ''یہ تو پوچھو کیسی کمائی کی ہے؟'' اور کہنے لگا: ''بہن کو فروخت کرنے کا سودا کر کے آیا تھا۔''

پھر کریم نے ساری بات بتائی تو نعمت نے کہا: ''لیکن مجھے کیوں کچھ کہے دیتے ہو؟''

''لیکن مجھ اکیلی نے وہ بیٹا جنا ہے؟ جیسا میرا ہے، ویسا ہی تمہارا ہے...''

کریم کچھ ٹھنڈا پڑ گیا اور کہنے لگا: ''سونے کو بھی گلانا پڑتا ہے اور لوہے کو بھی صیقل کرنا پڑتا ہے، اگر اسے بری صحبت سے ابھی نہ بچایا تو پھر بچا نہیں پائیں گے۔ اور نعمت کے پاس سے اٹھتا ہوا کہنے لگا: ''تم جمیلہ سے کہنا اسے کھانا کھلا دے گی۔''

شیریں جانتی تھی —— آج اتوار ہے، باقی کے تین صفحے وہ بڑی مرادوں سے پورے کر رہی تھی۔ آج کی صبح اس کے لیے ایک نئے دن کی طرح طلوع ہوئی تھی۔ لیکن اسے لگا —— اس کے سارے جذبوں کو آج کسی کی نظر لگ گئی ہے۔ جاگی —— تو کتنی ہی ٹیسیں دیہہ میں اٹھنے لگیں۔ سلامت کی چیخیں بھی اس کے حلق میں جا کر اٹک گئی تھیں۔

نہ جانے کتنی دیر آنکھیں نمناک رہیں، ہاتھوں میں کاغذ بھی تھامے لیکن سارے حروف پانی میں ڈبکیاں لیتے نظر آنے لگے۔

لیکن یہ لفظ اتوار کا طلسم تھا کہ جوں جوں دن ہوتا گیا اس کے ہاتھ میں ایک جنبش سی آتی گئی۔ نیم بے ہوشی کے عالم میں اٹھ کر اس نے باقی صفحے نقل کر لیے اور پھر سرہانے پر سر رکھ کر یوں لیٹ گئی —— جیسے اچانک آنکھوں کے آگے دن ڈوبنے کے بعد کی تیرگی لہرا گئی ہو۔

جمیلہ نے بڑی مشکل سے اُسے کھانا کھلایا، کریم نے دوبارہ آ کر اس کے ماتھے کو ہتھیلی سے چھوا تو جسم قدرے گرم لگا لیکن زیادہ نہیں۔

شیریں نے پھر ایک بار اٹھ کر سارے کاغذ اکٹھے کیے، اصل بھی اور نقل بھی اور نمبروار کر کے فائل میں بند کر دیے اور فائل ابا کو تھما دی اور خود ایک موٹی سی چادر لے کر یوں سو گئی، جیسے آج دوبارہ جاگنا ہی نہ ہو اور نہ ہی اس میں ہمت ہی رہ گئی ہو۔

نجے آیا لیکن بڑی دیر میں، شام ہو رہی تھی، آج کریم کو نجے کی شاید پہلے سے بھی زیادہ ضرورت تھی اس لیے اسے دیکھ کر اس کی دن بھر کی غیر حاضری کا غصہ نکالتا کہنے لگا: ''آدمی دوستی کرے تو چاند سورج سے جو اور کچھ نہیں تو وقت پر آ تو جاتے ہیں۔ آدمیوں کا کیا بھروسہ...

نجے سائیکل کو ایک طرف رکھتا، کریم کی چار پائی کے کنارے بیٹھ گیا اور کہنے لگا: ''یار! چاند تو اماوس کی چھٹی کرتا ہے لیکن تمہارے اس دوست نے کبھی چھٹی کی ہے؟''

کریم ہنس سا دیا، ہاں ہاں! اب تم کہو گے سورج بھی تو بادلوں کا محتاج ہوتا ہے۔

وہ تو ہوتا ہے... لیکن آدمی وہ جو غموں اور خوشیوں کا محتاج نہ ہو... نجے یہ کہہ ہی رہا تھا کہ کریم نے اس کی بات کاٹ کر کہا: ''اچھا فلسفی صاحب! دن بھر کہاں رہے؟''

''یار! اچانک پتہ چلا کہ ایک جگہ ایک چیک فلم کی سکریننگ ہو رہی ہے، بس رہا نہیں گیا وہاں چلا گیا۔ پہلے پتہ چلتا تو تمھیں ساتھ لے کر جاتا۔''

''اچھی فلم تھی؟''

''فلم اچھی تھی لیکن اس کے ساتھ ایک مختصر سی فلم تھی وہاں کے ایک عوامی رقص کی۔ جس کا نام تھا 'قرانکی رقص'۔''

''پھر تو زبان کی محتاجی بھی نہ ہوتی، میں بھی سمجھ جاتا۔''

’’میں نے تمھیں بہت یاد کیا اکیلے میں دیکھتا اور ہنستا رہا... کمال یہ تھا کہ دیکھ کر ہنسی آتی تھی اور سوچنے پر رونا آتا تھا۔‘‘

’’اچھا!‘‘

’’کسی نے بہت عمدہ رقص ترتیب دیا ہے۔ جب ترتیب دیا ہوگا تو بات بہت گہری سوچی ہوگی، ناچ یہ تھا کہ دس بارہ جتنے بھی آدمی ناچ رہے تھے، سب کے سروں پر بڑی بڑی ٹوپیاں تھیں لیکن کسی کو پتہ نہیں تھا کہ اس کی اپنی ٹوپی کہاں؟‘‘

’’وہ کس طرح بھئی؟‘‘

’’وہ یوں کہ ان میں سے کسی کے پاس بھی اپنی ٹوپی نہیں، وہ جلدی سے اپنی داہنی طرف کھڑے آدمی کی ٹوپی اتار کر سر پر رکھ لیتے ہیں اور وہ جس کی ٹوپی اتاری جاتی ہے وہ اپنے داہنی سمت کھڑے ہوئے کی ٹوپی اتار کر اپنے سر پر رکھ لیتا ہے اور پھر وہ...‘‘

’’میں سمجھ گیا، یوں بھی اپنے پاس کھڑے ہوئے کی ٹوپی اتارتے جاتے ہیں اور بات پھر وہیں سے شروع ہو جاتی ہے...‘‘ کریم نے کہا اور ہنسنے لگا۔

’’تو یوں سارے ہی دوسروں کے سروں سے ٹوپیاں اتارنے میں لگ جاتے ہیں۔‘‘ بنجے نے بتایا اور کہنے لگا: ’’یار! اگر سوچیں تو بات کتنی درست بیٹھتی ہے۔‘‘

کریم جلدی سے بولا—— ’’تمہارا مطلب ہے کہ تمام ملکوں میں یہی تماشہ ہوا کرتا ہے۔ واہ بھئی واہ، یہ فلم کس نے بنائی ہے؟‘‘

’’چیکوسلواکیہ نے۔‘‘

’’سمجھ گیا میاں! ان کا بھی کوئی بنجے ہوگا۔ جس نے یہ بات سوچی ہوگی۔‘‘

’’نہیں میاں! تمہارے بنجے سے بھی کہیں سیانے لوگ موجود ہیں۔‘‘

’’ہوں گے، لیکن تم نے جو دوزخ کا حال بیان کیا ہے، وہ کوئی چھوٹی بات تو نہیں۔‘‘

بنجے مسکرایا بھی لیکن اس کا چہرہ ذرا سا اداس بھی ہو گیا کہنے لگا: ’’لکھ تو لیا ہے، لیکن اب چھاپے گا کوئی نہیں۔‘‘

’’تم کہہ رہے تھے کہ کوئی اسے انگریزی میں...‘‘

’’وہ تو شاید ہو جائے گا چھپ بھی جائے گا لیکن یار! اس زبان میں لکھا ہو اس میں نہ چھپے

تو تسلی نہیں ہوتی۔ بات یہ ہے کہ ترجمے میں وہ بات نہیں آتی جو اپنی زبان میں ہوتی ہے۔ میں نے ترجمہ کیے ہوئے کچھ صفحے پڑھے ہیں۔‘‘

بنجے چپ ہو گیا تو کریم کہنے لگا: ’’ہاں سچ! شیریں نے اپنا کام مکمل کر لیا ہے۔‘‘

بنجے نے ایک بار شیریں کے کمرے کی طرف دیکھا، پھر کریم کی طرف دیکھتا ہوا کہنے لگا: ’’یار! یہ عجیب لڑکی ہے... خاموشی سے ایک نئی زبان سیکھ لی اور پھر اس قدر محنت کرتی ہے...‘‘

’’آج اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں، دیکھتا ہوں اگر جاگ رہی ہے تو۔‘‘ کریم اٹھ کر شیریں کے کمرے کی طرف چلا گیا، بنجے بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

شیریں سو نہیں رہی تھی لیکن شاید جاگ بھی نہیں رہی تھی۔ کریم الماری میں سے فائل نکالنے لگا تو بنجے نے شیریں کے قریب جا کر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور پوچھا: ’’بخار محسوس ہوتا ہے؟‘‘

شیریں نے نظر بھر کر بنجے کی طرف دیکھا، پھر آنکھیں بند کر لیں اور کہا: ’’نہیں۔‘‘

’’تمھیں معلوم ہے تم نے میری کتنی محنت بچا دی ہے اور میں نے فرصت کے ان دنوں میں ایک چھوٹی سی کہانی لکھ لی ہے۔‘‘

شیریں نے آنکھیں کھولیں۔ ایک نظر دیکھا اور کہا: ’’دے دیجیے، میں اس کو نقل کر دوں۔‘‘

’’ابھی تھکی نہیں ہو؟‘‘ بنجے زور سے ہنس دیا۔ ’’میرا تو خیال تھا، تم کہتی ہو گی کہ ناول کی مصیبت سے خدا خدا کر کے چھٹکارا ملا ہے۔‘‘

اور بنجے کو محسوس ہوا—— اس کی ہنسی اس کے حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ شیریں ایک ٹک اس کی طرف دیکھتی جا رہی تھی۔ اسی دن کی طرح جس دن بنجے کو لگا تھا کہ اس کی آنکھوں میں شکوے کی ایک لکیر سی ابھر آئی ہے۔

بنجے کمرے میں سے باہر چلا گیا لیکن پاؤں کی جنبش معمول کے مطابق نہیں تھی۔ یوں جیسے چوکھٹ کے پاس آ کر اکھڑ سے گئے ہوں اور باہر آنگن میں آ کر بھی...

شیریں پھر سو نہ سکی۔ تھک کر چارپائی پر سے اٹھنے لگی تو اٹھا نہ گیا۔ سارے بدن میں روح ناپید تھی—— لیکن اسے ایک عجیب سا احساس ہوا کہ ماتھے پر جہاں ابھی بنجے نے ہاتھ رکھا تھا وہ جگہ بہت زندہ ہے۔

ابر و باد کا دن تھا۔ سارا دن سورج کی روشنی بادلوں سے برسرِ پیکار رہی تھی اور اس کی طرح

نعمت کی جان بھی دردوں کے ساتھ نبرد آزما رہی۔

شام کے وقت جب تمام گھروں میں چراغ روشن ہوگئے۔ کریم کے گھر میں بھی نئی روشنی کی طرح ایک نومولود کے رونے کی آواز آنے لگی۔

اللہ تیری قدرت، آنگن میں بیٹھے ہوئے کریم کے من میں نعمت کی دردیں کئی باران الفاظ میں ڈھل گئی۔ اور اب جب دائی نے بچے کو نہلا دُھلا کر ایک موٹے کپڑے میں لپیٹ کر کریم کی گود میں ڈالا تو کریم نے آہستہ سے کہا: ''تم آ گئی ہو تاجی!''

دائی کے دل میں اس بات کا افسوس تھا کہ لڑکے کی جگہ لڑکی نے جنم لے لیا ہے۔ لیکن کریم کو یقین کی حد تک لڑکی کی امید تھی۔ اور اس نے جیسے لڑکی کو نہیں —— امیں کو بانہوں میں لے کر اس کے منہ کی طرف دیکھا۔

چراغ کی روشنی میں کریم نے لڑکی کا چہرہ دیکھ لیا تو اس کے پاؤں خود بخود کمرے کی دہلیز کی طرف اٹھ گئے۔ باہر صرف آسمان کا ملگجا اندھیرا تھا لیکن کریم کی آنکھیں آسمان کو اس طرح ٹٹولتی رہیں جسے وہاں بھی اس نے ایک چہرہ دیکھنا ہو۔ اس کے تصور میں ممتاز کا چہرہ تھا لیکن دوبارہ اندھیرے میں بھی واضح طور پر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

آسمان خالی تھا۔

کریم کی آنکھیں شکست خوردہ سی رہ گئیں... پھر جھک کر گود میں پڑی بچی کے منہ کو تکنے لگا۔

کمرے کی روشنی کریم کی عقبی جانب تھی، اس لیے گود کی سمت صرف اندھیرا تھا بچی کا منہ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن وہ گود میں تھی، خواہ اندھیرے کے ایک ٹکڑے جیسی لیکن وہ اس کا اندازہ نہیں وجود تھا جیتا جاگتا، متحرک اور چھوٹی چھوٹی سانسیں لیتا ہوا وجود۔

اور پھر جب گھڑی بھر کے بعد کریم کی آنکھیں اوپر اٹھیں تو سامنے آسمان کی ظلمت میں سے چاند کی ایک چھوٹی سی قاش نیچے زمین کی طرف جھانک رہی تھی۔

اندھیرا اب خالی خالی نہیں تھا...

بچی کو بانہوں میں بھرے کریم کے دونوں ہاتھ اوپر اٹھ گئے... دعا مانگتے ہاتھ...

دعا کے الفاظ کریم نے ہونٹوں پر نہیں تھے لیکن ہلکی سی کپکپی تھی... حروف کی باریک لکیروں کی طرح...

تجھے کے سوا کریم کا یہ راز کوئی نہیں جانتا تھا اور نہ ہی اس نے اب تک کسی کو بتایا، لیکن بچی کے چہرے کو دیکھ کر کریم کے منہ سے اس کا نام تاجی نکلا تھا اور سب نے اسی نام کو قبول کر لیا کسی نے بھی اس نام کو لفظ ممتاز سے جوڑ کر نہیں دیکھا تھا، اس لیے برکت نعمت کو گڑ کا حلوہ کھلاتی کہنے لگی لڑکی کا نام تاجی رکھا گیا ہے۔

نعمت اب دردوں سے رہائی پا کر ہلکی ہوگئی تھی کہنے لگی: ''اچھا ہے، بڑی ہوئی تو سر تاج کہہ کر بلایا کریں گے۔''

گو اب پھاگن کی آمد آمد تھی لیکن ابھی گہری شام کی ٹھنڈک نہیں ٹوٹی تھی۔ اس لیے کریم نے بچی کو نعمت کے گرم بستر میں لٹا دیا۔

ننھا عبداللہ تاجی کو دیکھنے پر بضد تھا۔ اس لیے برکت نے اسے منٹ بھر کے لیے کمرے میں لا کر بچی دکھا دی۔ تو عبداللہ اپنی انگلی سے اس کا چہرہ چھوتا ہوا بولا: ''تاجی ماجی آ گئی۔''

اور ننھی تاجی سوتے میں مسکرا دی —— جیسے اس نے کئی معنوں والے اپنے نام کو سن لیا ہو اور دھیرے سے سب پر ہنس پڑی ہو۔

تجھے کا ناول ترجمہ ہو کر ایک ہفت روزہ میں بالاقساط چھپنے لگا۔ تین مہینوں میں ان قسطوں کے چھپتے ہی کتابی صورت میں آنے کا انتظام بھی تھا لیکن اپنی زبان میں حالت پچھلے سالوں سے بھی بدتر تھی۔ تجھے نے جس پبلشر سے بھی پوچھا، اس نے ناول کے ساتھ ایک ہزار روپے کا بھی مطالبہ کیا۔ گو کہنے کو تو یہ کہا جا رہا تھا کہ ناول بکنے کے بعد یہ روپے مصنف کو لوٹا دیے جاتے ہیں۔ لیکن ابھی تک اس نے کسی سے اس روپے کی واپسی کی گواہی نہیں پائی تھی۔ اس لیے اس نے اپنا ناول کسی کو نہیں دیا۔

میز کی دراز میں پڑے ہوئے ناول کے سارے صفحے آہستہ آہستہ درد کی ایک تہہ کی طرح منجمد ہوگئے۔

تجھے اب اپنی میز کی اس دراز کو کھولتا نہیں تھا۔ لگتا تھا کاغذوں کو ہاتھ لگایا تو ان کے حروف لہو کے قطروں کی طرح ٹپکنے لگیں گے۔

ناول ترجمہ ہو کر جب سے قسط وار چھپنا شروع ہوا تو تجھے کو ایک ایک کر کے تین اور

زبانوں کے اشاعتی اداروں سے خط موصول ہوئے جوانھیں اپنی اپنی زبان میں ترجمہ کرنے کے حقوق طلب کر رہے تھے اور سجے کو جیسے ایک ہی سانس میں ٹھنڈی ہوا کا جھونکا بھی محسوس ہوا تھا اور گرم سلگتی ہوا کا بھی۔

ایک دن کریم آیا تو سجے اسی گرم وسرد سانس کے درمیان بولا: ''میاں! تم نے دنیا کی ہزار گالیاں سنی ہوں گی لیکن میں تمھیں ایک عجیب گالی سناؤں جو تم نے کبھی نہ سنی ہوگی۔''

کریم کچھ نہ سمجھا تو سجے کہنے لگا: ''دنیا میں ایک چھوٹی سی جگہ ہے، چھوٹا سا ملک اس کا نام ہے داغستان اور وہاں کی ایک گالی ہے —— اگر کوئی شخص بہت غصے میں ہو تو دوسرے سے کہتا ہے جاؤ تم پر خدا کا قہر ہو اور تم اپنے محبوب کا نام بھول جاؤ۔''

''واہ...واہ... کس دل والے نے یہ گالی ایجاد کی ہے۔ کمال ہے بھئی...'' کریم ہنسنے لگا۔

مجھے محسوس ہو رہا ہے... کہ ہماری زبان کو بھی کسی کی بددعا لگی ہے۔ ضرور کسی نے اس کو یہی بددعا دی ہوگی۔ اسی لیے تو تُو اپنے ادیبوں کے نام بھول گیا ہے... سجے نے کہا تو کریم کی ہنسی منجمد ہو کر رہ گئی۔ سچ کہا ہے —— خدا، محبوب اور ادیب میں کوئی فرق نہیں ہوتا، ایک ہی بات ہوتی ہے۔

گو کریم کے پاس اردو کے سوا کسی زبان کا حرف سمجھنے کی صلاحیت نہیں تھی لیکن وہ ہر ہفتے سجے کے ناول کی چھپی ہوئی قسط کو صرف شوق سے دیکھتا ہی نہیں تھا بلکہ اس دن کا رسالہ خرید کر اپنے پاس سنبھال کر رکھ لیا کرتا تھا۔

آج بھی اس ہفت روزہ کا شمارہ اس کے ہاتھ میں تھا۔ کریم چند منٹ تک اس کی طرف یوں دیکھتا رہا جیسے حروف کو جوڑ کر اس کی عبارت پڑھ رہا ہو پھر اچانک نظر اوپر اٹھا کر سجے سے کہنے لگا: ''اچھا، تو پھر ہو گئی بات۔''

''کیا؟''

''یہی کہ اب ہم اپنی زبان کو لگی بددعا زائل کر دیں گے۔''

''کیا مطلب؟''

''یار! بہت دنوں سے ایک بات دل میں آ رہی تھی لیکن شاید کچے پھل جیسی تھی جسے میں نے دل کی شاخ سے چنا نہیں تھا آج لگتا ہے وہی کچا پھل پک گیا ہے۔'' کریم کے منہ پر بھی یہ

بات کہتے ہوئے پکے ہوئے پھل کی سرخی دوڑ گئی اور بولا: ''قلم تمہارے ہاتھ میں ہے اور مشین میرے ہاتھ میں یار! ہم دونوں مل کر اپنی زبان کے نام پر لگے داغ دھبے دھو سکتے ہیں۔''

سجے نے کریم کی طرف یوں دیکھا —— جیسے وہ گوشت پوست کا ایک وجود نہ ہو بلکہ مستقبل کی ایک شاہراہ ہو۔

''لڑکا اب ہوشیار ہو گیا ہے۔ کمپوزنگ میں اس کام کے لیے اب محتاجی نہیں رہی۔'' کریم نے کہا تو سجے راستے کی طرف دیکھتا راستے کی مشکلات کا اندازہ لگانے لگا۔

''لیکن میاں! تمہاری نوکری سے تو گھر کے افراد روٹی کھاتے ہیں۔''

کریم بول پڑا: ''تو میں کون سا ابھی استعفیٰ دینے لگا ہوں، ابھی تو اپنی مشین کے لیے اتوار ہی کافی ہے۔''

سجے نے پھر بھی حامی نہ بھری تو کریم کہنے لگا: ''لڑکے کو ابھی دو ایک دھیلہ بھی نہیں دیتے کہتے ہیں ابھی غلطیاں کرتا ہے اگر میں پانچ سو کا ٹائپ خرید کر اسے گھر میں لا دوں تو کون سا برا ہے، غلطیاں تو خود دیکھ لیتا... رہ گیا کاغذ کا خرچ...''

''نہیں کاغذ کی بنی ہوئی چھوٹی مشین ڈھائی ہزار میں آتی ہے لیکن وہ بات بھی چھوڑو، جب تک نہیں لگتی نہ سہی، فرمے باندھ کر کسی کی مشین پر لگا لیں گے۔''

پانیوں پر جیسے چاند کی چاندنی جادو کر دیتی ہے، اسی طرح سجے کے قلب سے بھی کئی لہریں اٹھیں۔ اپنی زبان کے کئی صدیوں کے شاہکار جو وقت کی گرد میں اٹے پڑے تھے سفید کاغذ میں لپٹے سامنے آ گئے... دنیا کے کئی اور شاہکار بھی... اپنے ذہن میں پڑے ہوئے کئی ناولوں کے خاکے بھی... اور ایک ادبی پرچہ بھی۔ سجے نے اپنی میز کے پاس کھڑے ہو کر کریم کی طرف بھی دیکھا اور کھڑکی میں سے باہر آسمان کی طرف بھی —— جہاں کتنے ہی بادلوں پر سورج کی لال اور سنہری کرنیں اپنا عکس مرتب کر رہی تھیں۔

کریم کی آواز کے ساتھ اس کی نظر پھر کمرے کی طرف گئی وہ کہہ رہا تھا: ''لاؤ! ناول کے ابتدائی سولہ صفحات نکال دو۔''

''لیکن میاں! ابھی تو ٹائپ خریدنا ہے۔''

''وہی تو خریدنا ہے، اسی لیے تو صفحے مانگتے ہیں، یوں ہی کیسے پتہ چلے گا کہ کون سے

حروف کتنے خریدنے ہیں۔"

"اور خریدتے ہوئے وہاں پہلے بیٹھ کر کمپوز کرنا ہوتا ہے؟"

"ہاں میاں! وہیں بیٹھ کر کمپوز کرنا ہوتا ہے اور پھر نکال کر وہ سکہ ٹکوانا ہوتا ہے۔"

بنجے کے ہاتھ پر حرکت کی وہ کپکپی طاری ہوگئی جو قلم کار کے ہاتھ پر اس وقت آتی ہے جب سفید کاغذ پر اس کی تخلیق کے ابتدائی الفاظ اترتے ہیں۔

بنجے نے میز کی دراز کھول کر پہلے صفحے یوں اٹھائے جیسے درد کی ایک تہہ توڑ دی ہو۔ پھر اس نے وہ صفحات کریم کو دیتے ہوئے الماری سے دوسو روپے نکال کر بھی کاغذوں کے ساتھ رکھ دیے اور کہا: "اگلے ہفتے ناول کی قسط کے اور پیسے آجائیں گے تو کچھ اگلے صفحے خرید لیں گے۔"

کریم نے کاغذ لے لیے روپے لوٹاتا ہوا کہنے لگا: "اگلی بار لوں گا، پہلی بار تو تاجی کے جنم کی نشانی دینی ہے۔"

بنجے مسکرا دیا — "نشانی کا حق صرف تمہارا ہے، میرا نہیں؟"

کریم نے روپے لے لیے اور کہنے لگا: "اچھا پھر دونوں مل کر نشانی دیتے ہیں، میں اس میں اپنی نشانی بھی شامل کرلوں گا۔"

ایک بات سوجھ گئی۔ بنجے نے کہا اور ہنس کر کریم کے کندھے پر ہاتھ رکھتا کہنے لگا: "پریس کا نام تاجی کے نام پر رکھیں، تیری ممتاز کے نام پر تاج پریس۔"

کریم نے آدھی چھٹی لے کر دوپہر تک سلامت کو ٹائپ خرید دیا اور گھر آکر سب کچھ سلامت کے حوالے کرتے ہوئے کہا — "دیکھ برخوردار! اگر آدمی کے ہاتھ سیانے ہوں تو کام کوئی بھی چھوٹا نہیں ہوتا۔ آج سے گھر کا ایک کمرہ عمل کی درگاہ بن گیا ہے تم جتنا عمل اس درگاہ پر چڑھاؤ گے اتنی ہی مراد پاؤ گے۔"

کریم نے آنگن میں لاکر رکھے سارے سامان کی طرف دیکھا تو لگا — کہ آج اس کی شریانوں میں کوئی نیا لہو دوڑنے لگا ہے۔ جہاں مدتوں سے کوئی خواب نہیں تھا وہیں کچھ اُگنے اور نمو پانے لگا تھا۔

اس نے محبت سے بھرا ہاتھ سلامت کے سر پر رکھا اور کہنے لگا: "جاؤ اپنی دونوں ماؤں کے پاؤں کو چھوؤ اور پھر خدا کا نام لے کر کام پر لگ جاؤ۔"

کریم جب سلامت کی عمر کا تھا، اس سے کچھ زیادہ عمر کا، پرانے استادوں کے قصے سناتے اس نے ایک ہی سپنا دیکھا تھا — کہ کاش وہ ان قصوں کو ہی چھاپ اور بیچ کر تمام زندگی گزار سکتا۔ لیکن یہ خواب عمر بھر ایک ٹوٹے ہوئے پر کی طرح اس کے دماغ میں ہلتا رہا — اسے پرواز نہیں مل سکی تھی لیکن آج اسے محسوس ہوا کہ وہی مرا ہوا سپنا اس کی آنکھوں کے آگے دوبارہ زندگی لے رہا تھا۔

آنکھوں میں نمی سی آگئی تھی — اور سامنے سلامت کے جوان ہوتے چہرے کی جگہ اپنا چہرہ دکھائی دینے لگا — جب وہ خود جوان تھا...

اس کے تصور کی کرامات اس کے اعضا میں دوڑ گئی۔ وہ سائیکل لے کر اپنے کام پر جانے لگا تو محسوس ہوا — آج اس کے بدن کو پر لگ گئے ہیں۔ جس دن کریم نے سلامت کو بہت مارا تھا اس دن شیریں نے کسی کے سامنے کچھ نہیں کہا تھا لیکن دوپہر کے وقت چوری سے اس کے کمرے میں جاکر اس کے سر کو سینے سے لگاکر کتنی دیر روتی رہی تھی۔ اس نے سلامت کو چوری چوری دودھ کا گلاس پلایا، اس کے بدن کا مساج کیا تو سلامت کے سوا کسی کو پتہ نہیں تھا کہ جب دوسرے دن ابا کے کہنے پر اس نے جمال کے خط کے ٹکڑے کر کے ساتھ پانچ روپے رکھ کر جمال کو واپس کیے تھے، گھر واپس لوٹنے پر شیریں نے اس سے کتنا پیار کیا تھا۔

شیریں کو معلوم تھا — کہ سلامت میں ایک ہی خرابی ہے کہ اسے کھانے کی چٹخارے دار چیزوں سے بہت محبت ہے۔ وہ جمال کے دیے پیسوں میں سے ایک روپیہ بھی جیب میں ڈال کر گھر نہیں لایا تھا۔ اس نے سیر ہو کر تلی ہوئی مچھلی کے کباب ہی کھائے تھے اور اس دن سے جب بھی بس چلتا شیریں سب سے چھپا کر اسے گھی اور شکر والی من پسند روٹی کھلانے لگی تھی۔

دوبار برکت نے دیکھ بھی لیا تھا اور کہا بھی تھا — گنتی کی ہڈیاں، نپا تلا شوربہ، سب کچھ اس چٹورے کے لیے تو نہیں، اوروں کے منہ میں بھی دینا ہوتا ہے لیکن شیریں نے یہ سب کچھ اپنے پر سہہ لیا تھا اس لیے سلامت شیریں کا غلام بے دام بن کر رہ گیا تھا۔ اور اس نے شیریں کا یہ حکم بھی مان لیا تھا کہ اب کبھی جمال سے نہیں ملے گا۔

آج کریم جب دوپہر کا کھانا کھاکر کام پر چلا گیا تو شیریں نے سلامت کے ساتھ مل کر کمرے میں سارا سامان رکھا اور پھر اسے گھی شکر والی روٹی کھلا کر کہنے لگی: "جانِ ہمشیر! پہلے جس

طرح چوری چوری مجھے پڑھاتے رہے ہو اسی طرح چوری چوری مجھے یہ کام بھی سکھادو۔"

"تم کمپوزنگ کروگی؟" سلامت حیران سا ہو گیا تو شیریں ہنس پڑی۔ "تم تھوڑی دنوں میں دیکھ لینا، تم سے بھی جلدی کردیا کروں گی ابھی کسی کو بتانا نہیں۔"

"ابا کو بھی نہیں؟"

"نہیں۔"

"اور بھائی جان کو؟"

"بالکل نہیں۔"

"مجھے پتہ چل گیا۔" سلامت ہنسنے لگا اور کہنے لگا: "تم نے پہلے بھی ایک دن جس طرح بھائی جان کو حیران کردیا تھا، اب بھی سارا کام سیکھ کر تم نے بھائی جان پر رعب ڈالنا ہے۔"

شیریں کے چہرے پر ہلکی سی زردی دوڑ گئی۔ ہونٹوں کے پاس کچھ ہوک جیسا درد آ گیا کہنے لگی: "نہیں سلامت! میں نے کسی پر رعب جما کر کیا لینا ہے۔" اور پھر کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگی: "تم مجھے اچھی طرح سکھادو۔ تم نے جو بھی سیکھا ہے۔ پھر تم اور میں مل کر بڑا سا پریس لگائیں گے۔"

"لیکن پریس میں مشین بھی ہوتی ہے۔"

"وہ بھی لگائیں گے۔"

"کہاں؟"

"یہیں۔"

"لیکن اب کوئی دوسرا کمرہ نہیں بچا۔"

"میرا کمرہ جو ہے۔"

"لیکن وہ تو جمیلہ کا بھی ہے؟"

"آدھا، تم اپنا آدھا اسے دے دینا، پھر وہ سارا میرا ہو جائے مشین کے لیے۔"

"نہیں میں اپنا کمرہ جمیلہ کو نہیں دوں گا۔"

"تو ہم چھپ پر ایک کمرہ اور ڈال لیں گے۔"

"ابا پیسے نہیں دیں گے۔"

"نہ سہی، ہم خود ہی کام کر کے جمع کر لیں گے، تم اور میں۔"

"اور مشین کون چلائے گا؟"

"میں ابا سے سیکھ لوں گا، تم بھی سیکھ لینا۔"

سلامت کچھ سوچنے لگا۔ پھر بولا: "ایک آدمی اور چاہیے۔"

"وہ کس لیے؟"

"یہ دیکھ! یہ لکڑی کے خانے بنے ہوئے ہیں نا، ان میں علاحدہ علاحدہ حروف ڈلے جاتے ہیں۔ پھر جس حرف کی ضرورت ہو، وہ اس کے خانے میں سے نکال کر جوڑا جاتا ہے۔"

"اچھا..."

"اور پھر جب جوڑے ہوئے صفحے کاغذوں پر چھپ جاتے ہیں، سارے حروف نکال کر پھر خانوں میں ڈالنے ہوتے ہیں۔"

"ہاں، وہ تو ڈالنے ہی ہوں گے۔"

"جانتی ہو اسے کیا کہتے ہیں؟ اسے کہتے ہیں ڈسٹری بیوٹ کرنا۔"

"اچھا۔"

"اس کے لیے ایک آدمی اور چاہیے۔"

"وہ بھی تم اور میں ہی کر لیا کریں گے۔"

"لیکن جتنی دیر اس میں لگتی ہے، اتنے میں اور کتنا کام ہو سکتا ہے۔"

"پھر عبداللہ ذرا بڑا ہو جائے گا تو اسے سکھا دیں گے۔"

سلامت پھر اپنی عمر سے بڑا ہو کر کچھ سوچنے لگا اور بولا: "جمیلہ اتنی بڑی ہو گئی ہے، وہ کیوں نہیں سیکھتی؟ وہ تو لکھنا پڑھنا بھی نہیں سیکھتی۔"

"اس کی مرضی..." شیریں نے کہا اور عجلت زدہ ہاتھوں سے کہنے لگی: "چلو تم مجھے سکھادو۔"

سلامت لفافے میں لپیٹ کر لائے ہوئے بچے کے ناول کے وہ صفحات جو اس نے صبح ٹائپ خریدتے وقت کمپوز کیے تھے اٹھا کر کہنے لگا—— "میں نے صبح جلدی میں یہ صفحے وہاں اکیلے ہی کمپوز کیے تھے۔"

"پھر سبھی کھول دیے، سکہ جو تلوانا تھا۔"

''اب یہی کرنے ہیں نا۔''

''ہاں یہی کرنے ہیں اور اب تو ذرا احتیاط سے بھی کرنے ہیں کہ غلطیاں نہ ہوں۔''

''لیکن اگر کوئی غلطی ہو جائے؟''

''وہ تو سب سے ہو جاتی ہے۔''

''پھر وہ غلطی ہی چھپ جاتی ہے؟''

''نہیں، ساری غلطیاں پہلے ٹھیک کرنی پڑتی ہیں۔''

''وہ کس طرح؟''

''دیکھو! چار یا آٹھ صفحے بنا کر، ان کو یوں رکھ لیتے ہیں نیچے زمین پر، پھر اوپر سیاہی والا رولر پھیر کر ایک کاغذ پر ان کا پروف نکالتے ہیں بس اسے پڑھ کر ساری غلطیوں کا پتہ چل جاتا ہے۔''

''اور پھر!''

''جہاں غلطی ہوئی وہیں نشان لگا دیا۔ پھر نشان دیکھ دیکھ کر غلطیاں ٹھیک کر لیتے ہیں۔''

''تم نے یہ سب کچھ سیکھ لیا ہے؟''

سلامت ہنسنے لگا۔ ''جو کمپوز کرتے ہیں وہ صرف غلطیاں لگاتے ہیں پروف نہیں پڑھتے۔''

''پھر وہ کون دیکھے گا؟''

''وہ تو بھائی جان دیکھیں گے۔ وہ پہلے بھی پریس میں جا کر پروف دیکھا کرتے ہیں۔''

سلامت باتیں کرتا ساتھ ساتھ تھیلی سے نکال کر فرش پر بچھاتے حرفوں کو چن کر علاحدہ علاحدہ خانوں میں ڈالتا جا رہا تھا اور شیریں کی نظر لکھے ہوئے کاغذ پر تھی۔ جسے دیکھ دیکھ کر وہ خانوں میں سے حروف نکال کر ایک قطاریں جوڑ رہا تھا کہ اچانک ہاتھ کا حرف ہاتھ میں ہی رہ گیا اور وہ سلامت کی طرف دیکھنے لگی۔ سلامت کی طرف نہیں، اس سے بھی آگے، جہاں بادلوں میں گھرے اور بادلوں کو چیر کر نکلتے کسی شعلے کی طرح سنجے کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔

سنجے اپنے کمرے میں میز پر کاغذ رکھے کرسی پر بیٹھا کاغذوں پر یوں جھکا تھا، جیسے اس کا تمام وجود صرف دو آنکھیں اور ہاتھ کی جنبش بن گیا ہو۔

کریم کس وقت کام سے واپسی پر اس کی سیڑھیاں چڑھ کر اس کی چوکھٹ پر آ کھڑا ہوا تھا، سنجے کو کچھ پتہ نہیں تھا۔

کریم نے آواز نہیں دی۔ چپ چاپ کمرے میں آ گیا اور دیوان پر بیٹھ کر ایک بیڑی پینے لگا۔

یہ شاید ہوا میں گھلی بیڑی کی باس کا اثر تھا کہ سنجے کو اچانک سگریٹ کی طلب محسوس ہوئی۔ اس نے میز پر پڑی ڈبیا میں سے ایک سگریٹ نکالی لیکن ماچس تھام کر جب سگریٹ سلگانے کے لیے سلائی تلاش کی تو، دیکھا کہ ماچس خالی تھی۔ سگریٹ اسی طرح اس کے بائیں ہاتھ کی انگلیوں میں رہا تھا۔ جیسے دوسری ماچس تلاش کر کے سلگانے کی بابت بھول ہی گیا ہو۔ چنانچہ اس نے دائیں ہاتھ میں پھر قلم تھاما اور لکھنے لگا۔ کریم نے اٹھ کر اپنی ماچس میں سے ایک سلائی سلگا کر اس کے سامنے کر دی۔

سنجے نے پل بھر کے لیے سلائی کی طرف یوں دیکھا —— جیسے کسی غیبی ہاتھ کی کرامت دیکھ رہا ہو پھر دوسرے پل حواس کو مجتمع کر کے ہنس پڑا۔

''کریم میاں! تم کب آئے؟''

''تم یہ بتاؤ کہ آج کس تخلیق میں مگن ہو؟''

''میں کاغذ بنا رہا ہوں۔''

''سمجھ گیا۔ اب تمہارے تاج پریس کو ہر روز کاغذ کی ضرورت ہو گی۔ کوئی نیا افسانہ لکھ رہے ہو یا کوئی نیا ناول شروع کیا ہے؟''

''نہیں میاں! کورے کاغذ بنا رہا ہوں۔ دودھ جیسے سفید کاغذ...''

کریم میز پر رکھے کتنے ہی لکھے ہوئے کاغذوں کی طرف دیکھتا کہنے لگا: ''ادیب تو سفید کاغذوں کو سیاہ کرتے ہیں۔''

سنجے مسکرا دیا۔ ''میں الٹا کام کر رہا ہوں۔ سیاہ کاغذوں کو سفید بنا رہا ہوں۔ تم یہ سمجھ لو کہ میز پر کاغذ بنانے کا چھوٹا سا کارخانہ کھل گیا ہے۔''

کریم کچھ نہ سمجھ پایا۔ سنجے کہنے لگا —— ''پریس کے لیے اب کاغذ چاہیے نا، کتنے رم کی ضرورت ہو گی؟''

''دو سو صفحوں کے ناول کی ایک ہزار کاپی کے لیے تیرہ رم چاہئیں۔''

''بس وہی تیرہ رم بنا رہا ہوں۔ تم دیکھنا صرف پندرہ دنوں میں تیرہ رم بنا لوں گا۔''

اور نجمے نے کریم کو پوری فصاحت سے بتایا: ''ترجمے کی ایک کتاب مل گئی ہے۔ اگر بیس صفحے ہر روز کروں تو پندرہ دنوں میں اس کے پورے تین سو صفحے ہو جائیں گے۔ پھر اتنے پیسے سہولت سے مل جائیں گے کہ ہم تیرہ رم کاغذ خرید سکیں۔''

کریم نے ایک اور بیڑی سلگائی اور دیوان پر بیٹھتا کہنے لگا: ''مجھے ایک بات بتاؤ کہ تمہاری خوش بخت ماں نے تمھیں کیا کھا کر جنا تھا؟'' اور کریم تان اڑا کر پیلو کے قصے میں سے ایک شعر گانے لگا۔

جس دن جمی صاحباں ہور نہ جمیا کوئے

نجمے نے وجد میں آ کر شعر سنا اور کہنے لگا: ''یہ بات غلط ہے میاں۔ اسی دن کسی ماں کے گھر کریم بھی تولّد ہوا تھا۔''

''اچھا پھر اٹھ! میں تمھیں لینے آیا ہوں۔ گھر چل کر اپنا تاج پریس دیکھ لو۔''

''ٹائپ خرید لیا؟''

''آج آدھی چھٹی لی تھی۔ صبح یہی کام کیا تھا۔ پھر سب کچھ سلامت کو سونپ کر کام پر چلا گیا تھا۔ اب گھر پہنچنے تک وہ چار صفحے تو کر چکا ہوگا۔''

''تو آج سلامت تمہارے ساتھ نہیں گیا تھا۔''

''اس نے کس لیے جانا تھا، اپنے پریس کا مالک ہو کر وہ دوسروں کی ملازمت کرے گا کیا؟''

''میں نے اب اس دن کی انتظار میں ہوں جب مجھے بھی اس غلامی سے رہائی ملے گی۔'' کریم نے کہا تو نجمے نے ایک طویل کش لے کر کہا: ''تمہارے پاس کام کرنے والا اکیلا سلامت ہے۔ تم اوپر کے انتظام کی فکر نہ کرنا وہ میں کرلوں گا لیکن کم از کم ایک کارکن اور چاہیے۔ پھر تم مشین مین ہو تو پریس کا کام چل سکتا ہے۔''

''نہیں میاں! باہر سے کوئی آدمی نہیں لیں گے، ایک تو ایمان دار آدمی نہیں ملتے۔ ہر روز ٹائپ چرا کر لے جاتے ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ گھر میں باہر کا آدمی نہیں آ سکتا۔''

نجمے شاید پل بھر کے لیے یہ بھول گیا تھا کہ ان کے پاس صرف ایک جگہ ہے۔ کریم کا گھر جہاں گھر کی عورتیں بھی ہیں بال بچے ہیں۔ اسی لیے اپنی غلطی کے احسان کے ساتھ چپ سا ہو کر رہ گیا۔

''بس ایک حسرت سی ہے کہ اگر شیریں اور جمیلہ کی جگہ دو لڑکے ہوتے تو پھر کس بات کی کمی تھی۔'' کریم نے کہا لیکن ساتھ ہی کہنے لگا: ''چلو ابھی تو وہ دور کی بات ہے کس لیے سوچیں، ابھی تو سلامت ہی یہ بوجھ اٹھا لے گا۔ پھر شاید سال بھر بعد اللہ نے چاہا تو سارے گھر کو ہی پریس بنا دوں گا۔ بال بچوں کے لیے اوپر کی چھت پر کمرہ ڈال لوں گا۔''

نجمے کو کریم کی ہمت پر رشک آ گیا۔ صبح سے اسے محسوس ہو رہا تھا کہ کالے کاغذوں سے سفید کاغذ بنانے والی ہمت کر کے اس نے بڑے جوکھوں کا کام کیا تھا لیکن کریم کے سامنے اسے یہ بات بھی بہت چھوٹی لگی۔

''چلو چلیں۔'' نجمے نے کہا اور میز پر دھرے کاغذوں کو میز کی دراز میں رکھنے لگا۔

کریم نے دیوان پر سے اٹھتے ہوئے کہا—— ''آج بس اپنے ہی دل پر ضبط پانے کی بات تھی کہ میں کسی سے لڑا نہیں، نہیں تو بات لڑائی تک آ ہی گئی تھی۔''

''کہاں؟''

''پریس میں۔''

''مالک نے کچھ کہا تھا؟''

''نہیں، وہ لوگ آئے تھے جو حفیظ صاحب کا مرثیہ گاتے پھر رہے ہیں۔ یار!..آج کل تمہارا نام بہت چڑھ گیا ہے۔''

''میرا نام؟ لیکن اس کا حفیظ صاحب کے مرثیے سے کیا تعلق ہے؟''

''چلو تمھیں راستے میں سناؤں گا۔''

نجمے نے کمرے کو مقفل کیا، نیچے جا کر اپنی سائیکل نکالی اور کریم نے اپنی سائیکل اٹھائی اور دونوں راستے میں باتیں کرنے لگے۔

''تمہارا ناول اس ہفت روزہ میں چھپ رہا ہے نا اس لیے اب چار ہفتوں سے تمہارا نام لوگوں کو بہت مشہور لگنے لگا ہے۔ وہ حرام زادے کہنے لگے کہ تمہارا بہت دوست ہے اسے کہو کہ وہ حفیظ صاحب پر ایک مضمون لکھ دے۔''

''سو تیری میری دوستی بھی بہت مشہور ہو رہی ہے۔'' نجمے ہنسنے لگا۔ لیکن کریم بدستور غصے

میں تھا۔ کہنے لگا: ''حرام زادے وہیں بیٹھ کر حفیظ صاحب کے وہ کرتوت سنانے لگے کہ بے اختیار کانوں کو انگلیوں سے ڈھانپ لینا پڑا۔''

''وہ تم نے پہلے بھی سنایا تھا۔''

''لیکن وہ سب کچھ کوئی ختم ہوگیا؟ کہنے لگے کہ آدمی بہت رنگین تھا۔ ایک بار وہ امتحانوں کا بڑا افسر بنا دیا گیا جو یہ دیکھتا ہے کہ امتحان دینے والا پاس ہوا ہے یا فیل۔''

''ایگزامنر۔''

''ہاں، ہاں...وہی اور اس کے پاس لڑکیاں آیا کرتی تھیں اپنے نمبر بڑھوانے۔''

''میاں! سمجھ گیا ہوں تیری بات۔''

''وہ ایک تو نمبر بڑھوا کر لے جاتیں اور ساتھ ہی حمل بھی لے جاتیں۔''

''چھوڑو میاں! کیسی بات چھیڑ دی تم نے۔'' ننھے نے کہا تو گویا کریم کا غصہ ابل پڑا کہنے لگا: ''پھر اوپر سے کہتے ہیں کہ ننھے صاحب سے کہو کہ اس کی شاعری پر ایک مضمون لکھ دے۔''

''میں نے تو اس کی شاعری پڑھی ہی نہیں۔ لیکن ایک چڑی مار کی اڑان بھی تو چڑیا جتنی ہی ہوتی ہے۔''

کریم کو اس بات پر اتنی ہنسی آئی کہ وہ ضبط نہ کر سکا اور اس پر ہنسی کا باقاعدہ دورہ پڑ گیا۔ وہ کہنے لگا: ''یہ چڑی ماروں کی استطاعت پرواز والی بات مجھے سوجھی نہیں تھی ورنہ میں وہیں کہہ دیتا...اچھا، اب بھی کسی دن سنا دوں گا، نہیں تو یونہی تمہارے پیچھے پڑ جائیں گے۔''

یوں باتیں کرتے کریم اور ننھے جس وقت گھر پر پہنچے تو ننھے نے آگے بڑھ کر سلامت کو بانہوں میں لے لیا اور اس کے ساتھ سیدھا اس کمرے میں چلا گیا جہاں تاج پریس کا چھوٹا سا پینا اندھیرے میں ٹمٹما رہا تھا۔

ننھے کو بالکل علم نہیں تھا —— کہ شیریں اس وقت آنگن والے کنوئیں کے پاس بیٹھ کر ہاتھوں کی سیاہی کو صابن سے دھو رہی ہے اور اس نے ننھے کو دیکھ کر جلدی سے اپنے ہاتھ بالٹی کی اوٹ میں کر لیے۔

فتہ کئی بار خود ہی چولہے پر اپنی روٹی سینک لیا کرتا تھا۔ لیکن ہر بار پیراں دتہ کی دوکان

سے گوشت روٹی لے آیا کرتا تھا۔ کئی بار مرچوں سے اس کا منہ...ہو جاتا تو وہ روٹی کا لقمہ منہ میں دبائے اسے پانی کے گھونٹ سے نگلتا اور پیراں دتہ کو گالیاں دیتا۔ حرام زادہ، صرف مرچوں کی کمائی کھاتا ہے۔ حلال کی کمائی تو اسے راس ہی نہیں آتی۔ لیکن پھر جب چار دن کے بعد منہ کا مزہ پھیکا پڑ جاتا تو وہ پیراں دتہ سے گوشت کی بوٹی اور شوربہ لے آتا۔ آج بھی کاغذ میں ایک روٹی لپیٹ کر اور کٹورے میں سالن ڈلوا کر وہ شام کے وقت پیراں دتہ کے یہاں سے گھر کو لوٹ رہا تھا کہ گلی میں موڑ پر اس نے شیریں کو دیکھا۔

''اس وقت کہاں سے آ رہی ہو؟'' فتے نے پاس آ کر شیریں کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ساتھ ہی کہا تم تو خیر سے سیانی ہو گئی ہو، دیکھو! میرے کندھے تک آتی ہو...''

شیریں کو ہنسی آ گئی۔ ''چاچا! تو کیا عمر بھر تمہارے گھٹنے تک ہی رہنا تھا...؟''

فتہ کریم سے کہیں زیادہ عمر کا تھا لیکن گلی میں سبھی لوگ فتے کو چاچا ہی کہتے تھے۔ کئی کے ماں باپ بھی اسے چاچا کہتے تھے اور آگے ان کے بچے بھی۔

''دیکھو نا! تم اتنی سی ہوا کرتی تھی، بالشت بھر کی، جب تمہاری ماں تمھیں اٹھائے ہوئے گزرا کرتی تھی...کل کی بات لگتی ہے...نعمت بالکل تمہارے جیسی تھی...فتہ کہہ رہا تھا۔ جب اس کا پاؤں گلی میں پڑے چھلکے سے پھسلا اور شیریں نے اس کا بازو تھام لیا اور اس کے گھر کے دروازے کے پاس پہنچ کر کہنے لگی: ''چلو چاچا! تم آگے چلو، میں روٹی اندر رکھ دیتی ہوں۔''

شیریں نے صرف اتنا ہی کہا، یہ نہیں کہا کہ چاچا! تمہاری یادداشت کو بھی تمہاری نظر کی طرح کچھ ہو گیا ہے۔ نعمت تو چھوٹی ماں ہے، میں تو برکت کی بیٹی ہوں۔

شیریں نے فتے کی چارپائی پر روٹی رکھ دی تو مڑتے ہوئے اس نے گھڑے کی طرف دیکھا۔ پوچھا —— ''چاچا! پانی کا گلاس بھر کر دے جاؤں؟''

''پانی میں خود ہی ڈال لوں گا تم میری ایک بات سن جاؤ۔'' فتے نے چارپائی کے کنارے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ''دیکھو نا! اگر سلمیٰ زندہ ہوتی تو وہ تم سے بھی لمبی ہوتی۔''

شیریں چارپائی کے پاس کھڑی ہو گئی تھی لیکن بیٹھی نہیں تھی۔ فتے کے منہ سے سلمیٰ کا نام سن کر اسے فتے کا درد محسوس ہونے لگا۔ چارپائی کے کنارے بیٹھتی خاموش ہو گئی۔

''دیکھو نا! میرے لیے جیسی سلمیٰ تھی ویسی تو ہو، اپنے کریم کی بیٹی جو ہوئی۔''

شیریں کو لگا —— فتے کے دل میں کوئی بات ہے مگر نہ جانے کیا ہے لیکن کوئی دل دُکھانے والی بات ہے۔ وہ چپ چاپ فتے کی منہ کی طرف دیکھنے لگی۔

''تم اب بے وقت گھر سے باہر نہ جایا کرو۔'' فتے نے کہا تو شیریں نے ہاتھ میں تھامی کاغذ کی چھوٹی سی پڑیا دکھاتے ہوئے کہا —— ''چاچا! میں کہیں دور نہیں گئی تھی صرف موڑ تک سوچا اماں کو پان کی لت لگی ہے۔ ابا ابھی آئے نہیں تھے، آج سلامت بھی صبح سے اس کے ساتھ ہے میں نے کہا —— میں ہی اماں کو پان لا دوں۔''

''بیٹی وہ تو کوئی بات نہیں، لیکن بُرے لوگوں کی منڈیاں بنی ہوئی ہیں... ہماری گلی تو پھر بھی اچھی ہے لیکن ساتھ کی گلی والے سُور کے بچے ہیں۔''

شیریں کے من میں پھیری والے جمال کی بات آ گئی۔ خواہ جب سے جمال نے وہ خط سا لکھا تھا اور اس خط کو پھاڑ کر سلامت نے اسے لوٹا دیا تھا اس وقت سے کوئی بات نہیں نکلی تھی لیکن شیریں کو اسی بات کا کھٹکا سا ہوا۔ پوچھنے لگی:

''کیوں چاچا! کیا بات ہے؟''

''تم اسے جانتی ہو، کیا نام ہے اس کا یونہی سا۔''

''کون؟''

''وہ پھیری والا۔''

''جمال اب بہت دیر سے شہر میں قلچوں کا خوانچہ لگایا کرتا ہے لیکن اس سے پہلے جب پھیری لگایا کرتا تھا، اس وقت سے وہ پھیری والا ہی کہلاتا تھا۔''

''یاد آ گیا، جمالو پھیری والا... نام تو اچھا بھلا ہے لیکن آدمی کے اعمال اچھے نہ ہوں تو اس کا نام بھی اچھا نہیں لگتا۔'' اور فتے نے کہا: ''تم پر وہ بُری نظر رکھتا ہے، میں نے اسی لیے کہا ہے کہ تم اندھیرے میں گھر سے باہر نہ جایا کرو، ان بدمعاشوں کا کیا بھروسہ۔''

شیریں کے چہرے پر شام کا رنگ اُمڈ آیا۔ چارپائی سے اٹھتے ہوئے کہنے لگی: ''اچھا چاچا۔''

''دیکھو نا! میرا عزت بیگ لاکھوں میں ایک ہے۔'' فتے نے کہا لیکن شیریں کچھ نہ سمجھی۔ اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گئی۔ ''چاچا! یہ عزت بیگ کون ہے؟''

فتہ ہنسنے لگا۔ ''وہ تمھیں تو بات کا ہی پتہ نہیں۔ وہی میرا خوب صورت شہزادہ۔ جو اپنے

کریم کا دوست ہے، بنجے صاحب۔''

شیریں کے منہ پر اُمڈ آئی شام کی سنولاہٹ پر ایک بار پھر دن کی سرخی دوڑ گئی۔ کہنے لگی:

''تم نے اس کا نام عزت بیگ رکھا ہوا ہے۔''

''ہاں، وہ میرا عزت بیگ ہے۔''

''وہ کس طرح؟''

''اک دن مجھے کہنے لگا —— ''کہ تیرا نام فتہ کیوں کر ہو گیا، کمہار ہونا چاہیے تھا۔''

''وہ کیوں چاچا؟''

''وہ جو لوگ سوہنی کا قصہ گاتے ہیں نا سوہنی مہیوال کا۔''

''ہاں، سوہنی کمہاروں کی بیٹی تھی، تلے کمہار کی، پھر؟''

میں نے کہا کہ ہوں تو میں بھی کمہار لیکن میں نے تلے جیسے نصیب نہیں پائے اور پچ جانا بیٹی! اسے دیکھ کر یونہی لگا کہ آج میرے دروازے پر وہی شہزادہ آ گیا ہے —— عزت بیگ۔''

فتے نے یہ کہتے کہتے پھر اسی دن کی طرح ماتھے پر ہاتھ دھر لیا۔ ''میری سلمٰی اگر زندہ ہوتی۔''

شیریں کے سارے بدن میں ایک گہرا اندھیرا اترتا چلا گیا۔ کہنے لگی: ''تو چاچا! اگر سلمٰی سچ مچ زندہ ہوتی پھر تم...'' اس کے بعد شیریں سے کچھ کہا نہیں گیا اور ان کہے حروف اس کے ہونٹوں کے پاس کانپنے لگے۔''

فتہ کہنے لگا: ''تمہارا ابا بھی پاس بیٹھا ہوا تھا، اس نے بھی یہی تیری والی بات پوچھی کہنے لگا: ''خدا شاہد ہے جھوٹ نہ بولنا، اگر سلمٰی زندہ ہوتی تو یہ میرا عزت بیگ تمھیں اس کے لیے قبول تھا؟ دیکھو قسمت کی ستم ظریفی اسی کو کہتے ہیں۔''

شیریں نے ایک تیکھے درد کے بوجھ سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

شاید اس سے پہلے شیریں نے کبھی درد کو اس طرح نہیں پہچانا تھا۔ اسے لگا جو بھی سوال ہوتا ہے صرف زندوں کے لیے ہوتا ہے۔ موت کے بعد ہندو اور مسلمان کا سوال بھی ختم ہو جاتا ہے۔ مرنے کے بعد سلمٰی اور ریتا میں کسی کو فرق محسوس نہیں ہوتا۔

شیریں کو فتے کی بات پر یقین نہ کرنے کا کوئی جواز نظر نہیں آیا۔ صرف یہ محسوس ہوا —— کہ موت کے درد کے آگے اسے وہ تمام سوالات بھول گئے تھے جو زندہ ہونے کی صورت میں

درپیش ہوتے ہیں۔

پھر وہ پل بھر کے لیے —— چاچا کے آنگن میں بیٹھی گویا اس کی سلمٰی ہو گئی تھی۔

فتے کے کندھے کے ساتھ سر لگا کر کہنے لگی: —— ''چاچا! میں تیری بیٹی نہیں؟''

شیریں کے منہ سے یہ الفاظ یوں نکل گئے جیسے من کی کسی کھوہ میں پروں کی طرح اگ آئے ہوں۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس نے اپنی ندامت آلودہ زبان کو کاٹ لیا۔ کہنے لگی: ''تم یوں اداس نہ ہوا کرو چاچا! ورنہ سلمٰی کی روح بھی اداس ہو جائے گی۔ میں نے اسی لیے کہا ہے...''

''ہاں... میں کب کہتا ہوں کہ تم میری بیٹی نہیں... دیکھو نا! آج تم آئی ہو تو مجھے دیواریں ''اپنی لگ رہی ہیں...''

اور چاچا! اگر تم کہو —— لڑکی کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتا کہنے لگا: ''جمالو خود بھی بدمعاش ہے لیکن اسے محلے کے لوگ بھی اکساتے ہیں —— کہتے ہیں کریم کی بیٹیاں کافروں کے ساتھ گھل مل کر رہتی اور ہنستی بولتی ہیں۔''

شیریں نے اور کچھ نہیں صرف اتنا کہا: ''چاچا! وہ تو بہت صاحب علم آدمی ہے، بڑا باشعور...''

فتے نے جلدی سے کہا —— ''تو کیا مجھے نظر نہیں آیا؟ یہ بے علم کیا جانیں۔ اس کے تو ماتھے پر ستارہ چمکتا ہے۔''

شیریں کا من کچھ سنبھلا۔ کہنے لگی: ''چاچا! وہ افسانے لکھتا ہے، کتابیں بھی...''

فتہ ہنس دیا۔ ایک دن مجھ سے کہتا تھا —— ''جب تم چاک پر پیالے اور صراحیاں بناؤ گے تو مجھے بلا لینا، میں تمہارے پاس بیٹھ کر پیالوں پر تصویریں بناؤں گا... سلمٰی بہت خوب صورت پھول بوٹے بنایا کرتی تھیں۔''

''اچھا چاچا! اسے خواہ مت بلانا مگر مجھے بلا لینا، میں تمہارے برتنوں پر بہت خوب صورت بوٹے بنا دوں گی۔'' شیریں نے کہا اور چارپائی سے اٹھ گئی۔

''اچھا... اچھا... تم آیا کرو بیٹی، مجھے تم میں سلمٰی نظر آتی ہے...'' فتے نے کہا اور ساتھ ہی فتے نے یاد دہانی کرائی۔ ''مگر تم چراغ جلنے کے بعد گھر سے نہ نکلا کرو۔''

شیریں کی پان والی مٹھی زور سے بھنچ گئی اور اپنے ہی ناخن ہتھیلی میں کھُپ گئے اور وہ باہر

گلی کی طرف جاتی سوچنے لگی —— گلیوں اور بازاروں میں دن کب ہوتا ہے؟ یہ اندھیرا تو دن بھر رہتا ہے اور رات بھر بھی...''

چیت کا کشادہ موسم تھا، یوں بھی صبح سے کریم کے من میں ایک خواہش انگڑائیاں لے رہی تھیں کہ وہ گھر بھر میں ٹہلتا پھر رہا تھا۔ آج صبح پہلے فرمے کے سولہ صفحے باندھ کر اس نے شہر لے جانے تھے۔ چھاپنے کے لیے اس لیے ابھی منہ اندھیرا ہی تھا۔ جب کریم کی تان سب کے کانوں میں پڑتی

دے یار! جہاں توں عشق تہاں نوں کتن کیہا

اور برکت اٹھ کر چاول پکانے لگی تھی۔ سلامت نے ہاتھ دھو کر نیا کرتا پاجامہ پہن لیا تھا اور شیریں نے اپنی الماری کو الٹ پلٹ کر پھول دار چکن کی وہ سیاہ قمیص نکال لی تھی جو کبھی برکت کی ہوا کرتی تھی۔ لیکن اسے تنگ ہو گئی تھی جسے شیریں نے بہت پہلے مانگ کر اپنی الماری میں رکھ لیا تھا۔

پھیلتی ہوئی روشنی کے ساتھ نجے کی سائیکل دروازے کے ساتھ آ کھڑی ہوئی۔ آج نصف فرما کریم نے اپنی سائیکل پر رکھ کر لے جانا تھا اور نصف نجے نے اپنی سائیکل پر۔

آج کریم نے دعا سلام کے بجائے آنگن میں داخل ہوتے ہوئے نجے کی طرف بازو لہرا کر وہی بول الاپا جو وہ پچھلے گھنٹے سے گا رہا تھا

دے یار! جہاں توں عشق تہاں نوں کتن کیہا

اور ساتھ ہی زور سے ہنس دیا۔ ''یہ میں پہلے بھی گایا کرتا تھا لیکن میں صبح سے سوچے چلا جا رہا ہوں کہ شاہ حسین نے یہ بات کیسے کہی۔ کیوں کیوں میاں؟ یہ بات کچھ درست نہیں کہی۔''

نجے کریم کے سوال کی تہہ کو پا گیا تھا، پر بولا کچھ نہیں۔ کریم کے منہ سے ہی سننے کے لیے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ کریم کہنے لگا: ''کاتنے اور دُھننے کا اصل مزہ تو اسی کو آتا ہے جسے عشق ہوتا ہے دوسرے تو بے کار میں پکڑے ہوئے ہوتے ہیں۔''

نجے مسکرا دیا۔ شاہ حسین نے جس کتائی کی بات کی ہے وہ بیگار کی بات تھی جس سے اکتا کر یہ شعر لکھا گیا۔ اپنی جگہ وہ ٹھیک ہے لیکن آج کاموں کی مشق بنتے دیکھتا تو یقیناً اور طرح لکھتا۔

شیریں نے گلاسوں میں چائے ڈالی اور ایک گلاس ابا کے آگے رکھا اور دوسرا نجے کے سامنے۔

شریں نے سیاہ چکن کی قمیص پہن لی تھی، کانوں میں چاندی کے وہ آویزے تھے جو نعمت نے تاجی کے جنم پر اسے اور جمیلہ کو دیے تھے لیکن شیریں نے ابھی بال نہیں گوندھے تھے۔ جب اس نے چائے کا گلاس بنجے کو دیا تو بنجے کی نظر اس کے چہرے پر جا کر جم گئی۔

صبح کی دھیمی روشنی میں وہ آنگن میں اتری ہوئی ماورائی مخلوق لگ رہی تھی۔ شیریں نے بھی نظر بھر کر دیکھا —— اس سے پہلے اس نے بنجے کے چہرے پر اپنے لیے ایسی نظر محسوس نہیں کی تھی اور اس کا سارا بدن کانوں کے آویزوں کی طرح ہلنے لگا۔

"کریم میاں!" بنجے کے منہ سے نکلا لیکن وہ کریم کی طرف نہیں اب بھی شیریں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

کریم سائیکل کے پیچھے فرموں کو بہت احتیاط سے باندھ رہا تھا تا کہ ہلنے سے ان کے مرتب الفاظ نہ ہل جائیں اس لیے اس نے بنجے کو آواز نہیں سنی تھی۔ وہ سلامت سے کہہ رہا تھا: "دو دو حروف زائد نکال کر کاغذ میں باندھ لو، کہیں چھپتے ہوئے کوئی حروف ٹوٹ گیا تو بدل لیا جائے گا۔"

"کریم میاں!" بنجے نے پھر کہا۔

کریم اس کی طرف لوٹا اپنے ہی گمان میں کہے جا رہا تھا۔ کاغذ میں نے تیرہ کی جگہ چودہ رم رکھوا لیا ہے۔ تیرہ میں پوری ایک ہزار چھپے گی۔ چودہ میں گیارہ سو چھپ جائے گی۔ چھپائی تو پریس کو جیسی ایک ہزار کی دینی ہے وہی گیارہ سو کی، سو کاپی زائد کیوں نہ چھاپ لیں۔"

اس وقت کسی اور نے نہیں فقط شیریں نے جانا کہ بات بنجے کو سنائی نہیں دی اور بنجے کی بات کریم نے نہیں سنی۔

اور پھر اس لمحے کو کریم نے بھی دیکھا —— دیکھا کہ چائے کا گلاس اسی طرح بنجے کے ہاتھ میں ہے اور اس کی باہر کی طرف دیکھتی آنکھیں —— باہر کی طرف نہیں، شاید باطن کے کسی کنج میں جھانک رہی ہیں۔

برکت آواز دے رہی تھی —— "جلدی نہ کرو، چاول ذرا سے کچے ہیں، منہ میٹھا کر کے جانا۔ کریم چارپائی کے کنارے بیٹھتا کہنے لگا: "میاں تمھیں تو شاہ حسین کی طرح سچ مچ کا تنا بھول ہی گیا۔"

بنجے ہنس سا دیا۔ "نہیں یار! کتائی کی بابت ہی سوچ رہا تھا۔ آج ذرا شیریں کو تو دیکھو۔"

"آو لڑکی! ادھر آؤ۔" کریم نے کہا تو شیریں کی روح مجتمع ہو کر آویزوں کی چاندی کی طرح منجمد ہو گئی۔

بنجے نے پھر ہاتھ سے ادھر اشارہ کیا اور کریم سے کہنے لگا: "کتاب کا سرورق بنوانا ہے نا... دیکھو یہ لڑکی ایسے لگ رہی ہے جیسے کتاب پر چھپی تصویر ہو۔" شیریں جہاں ایستادہ تھی۔ وہیں کھڑی رہ گئی... ایک کاغذ پر منجمد کچھ لکیروں اور گولائیوں کی طرح..."

کریم نے شیریں کی طرف دیکھا... پھر کسی مصور سے کہتے ہیں... ابھی اس نے اتنا ہی کہا کہ جمیلہ طشتریوں میں میٹھے چاول ڈال کر ان کے آگے رکھنے لگی۔

آج کی دوپہر شیریں گویا پورے اشاعت گھر کی مالک تھی —— اس پورے کمرے کی جہاں کمپوزنگ کی میز رکھی تھی۔ پاس ہی لکڑی کے خانوں والے ریک تھے، جن میں سکے کے حروف بھرے ہوئے تھے اور ادھر کونے میں چھوٹی سی الماری تھی، جس میں بنجے کا ناول کا پورا مسودہ تھا۔

شیریں نے ریندھنے پکانے میں اماں کا ہاتھ بٹایا۔ پھر اس کوٹھری میں جا کر مسودے کے اگلے صفحات نکالے اور کمپوز کرنے لگی۔ اس کی توجہ حروف پر تھی۔ عبارت کے معانی کی طرف نہیں لیکن اس ناول کی نقل اس نے اپنے ہاتھوں سے خود ہی تیار کی تھی۔ اس لیے عبارت کا مفہوم ان الفاظ میں سے نہیں بلکہ اس کی اپنی یادداشت میں سے برآمد ہو کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوتا۔

یہ ناول کا ابتدائی حصہ تھا۔ اگرچہ سولہ صفحات گزر چکے تھے پھر بھی ان میں موت کے بعد کی نیلی اور تصوراتی روشنی کے ذکر کے علاوہ بھی اور کچھ نہیں تھا لیکن یہ روشنی کا ایک جادو تھا —— جو شیریں کے تصور میں سمانے لگا تھا۔

حروف کے خانوں کی پہچان جیسے آہستہ آہستہ تمام کارکنوں کے ہاتھوں میں اتر جاتی ہے۔ شیریں کے ہاتھوں میں بھی اتر رہی تھی۔ ہاتھ لاشعوری طور پر مطلوبہ حروف کے خانے کی طرف چلا جاتا تھا —— اور شیریں کو پتہ بھی نہیں چلا کہ کس وقت اس نے تین صفحوں کے برابر مواد جوڑ لیا تھا۔

آنگن میں چڑھتی دھوپ اور اعضا کو چڑھتی تھکن دونوں حقیقتیں تھیں لیکن ناول کی عبارت بھی ایک حقیقت تھی —— جس کے مطابق آگ اور ہوا سے بنی روحوں کے وجود کو نہ وقت کا علم ہوتا ہے نہ تھکن کا۔

وہ بھی —— جیسے روحوں کے وجود والی دنیا میں ایک روح کی طرح تھی۔

اور پھر نئی عبارت میں اس نے بیتا کی روح کا وجود دیکھا...

آگ کی ایک گرم سی لکیر اس کے سارے بدن میں گزر گئی۔

وہ چھوٹی سی تھی جب اماں اسے راتوں کو پیڑوں کے نیچے کھڑا نہیں ہونے دیتی تھی، کہا کرتی تھی: ''درختوں پر رات کو روحیں رہتی ہیں بچوں پر ان کا سایہ پڑ جائے تو وہ لمحوں میں ہنستے ہنستے رونے لگ جاتے ہیں —— ''ایک بار سلامت جب بہت کم سن تھا، دودھ پیتے پیتے یوں رونے لگا کہ منٹوں میں نیلا پڑ گیا... اماں اسے لمبے کے مزار پر لے گئی تھی اور وہاں ایک پیر نے اس سے روح کا سایہ اتارا تھا۔

یہ بہت زمانہ کی بات تھی۔ شیریں کی یاد میں گم شدہ بات۔ ناول کی نقل کرتے ہوئے بھی یاد نہیں آئی تھی لیکن آج شیریں کو ایک بھولے ہوئے خواب کی طرح نظر آنے لگی تھی —— اور سامنے رکھی عبارت میں سے بیتا بھی برآمد ہو کر ان میں مل گئی تھی۔

لیکن وہ تو نیک روح تھی... شیریں نے بڑی ہوش مندی کے ساتھ ایک دلیل تلاش کی اور روحوں کے بارے میں سنی کہانیوں کو ہاتھ سے دور جھٹک دیا لیکن بیتا کا وجود اس کے اور بھی قریب آ گیا تھا، اتنا کہ شیریں کو لگا —— اس کے ہاتھ سے چھو رہا ہے۔

اس کا پورا وجود سُن ہو کر رہ گیا...

کون جانے... روحیں واقعی ہوتی ہیں یا نہیں اور اس وقت... شیریں کے ماتھے میں سے سوچ کی ایک شعاع پھوٹ کر ماتھے کی شریان کی طرح تن گئی۔

ناول کی عبارت میں ننھے کی روح کا ہاتھ بیتا کی طرف بڑھا اور ایک خانے میں سے کسی حروف کو پکڑنے کے لیے بڑھتا ہوا شیریں کا ہاتھ دھک سے ادھر دیوار کی طرف چلا گیا۔

ٹھوس دیوار نے شیریں کے ہاتھ کو گویا تھام لیا تھا۔ روک لیا تو شیریں کو ہوش آیا کہ وہ بیتا کی طرف بڑھتے ننھے کے ہاتھ کو گویا اپنے ہاتھ سے روک لینا چاہتی ہے۔

شیریں نے جھنجھلا کر اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا... سکے کا ایک حرف اس کی پوروں میں دبا ہوا تھا ''بیتا'' کے نام کا پہلا حرف۔

مجھ سے بیتا کا نام برداشت نہیں ہو رہا۔ شیریں کے ہاتھ میں تھما ہوا سکے کا چھوٹا سا حرف

بہت گراں ہو گیا۔

وہ کہیں نہیں... لیکن ہمیشہ رہے گی... اور شیریں کے ہاتھ میں تھما ہوا سکہ اس کے پورے جسم میں بھر گیا۔

کھڑکی کی چوکھٹ کے پاس دھوپ کی ایک لکیر آ گئی تھی۔ وہ جس چوکھٹ کو عبور کر کے کھڑکی سے ملحقہ میز پر گری۔ ان الفاظ پر جو شیریں نے کمپوز کر رکھے تھے تو شیریں کو صبح والی بات یاد آ گئی، ''دیکھو یہ لڑکی! کتاب پر چھپی تصویر جیسی لگ رہی ہے۔''

وہی دھوپ کی لکیر ادھر شیریں کے ہونٹوں کے پاس آ گئی تھی۔ بیتا ہمیشہ کتاب کے اندر ہی رہے۔ الفاظ کے درمیان، لیکن میں...

اور شیریں کو لگا وہ ساری کی ساری کتاب کی جلد منڈھی گئی ہے۔ ہونٹوں کے پاس ایک مسکراہٹ سی چمکی...

اس نے پھر کاغذ کی عبارت کی طرف دیکھا اور ہاتھ کے الفاظ کو عبارت میں کمپوز کر دیا۔

پھر اگلا حرف بھی تھام لیا اور اس سے اگلا بھی...

اور اس نے ننھے کا بیتا کی طرف بڑھتا ہاتھ بدستور بڑھنے دیا۔

اس وقت —— پورے کا پورا ننھے ایک نیلی تصوراتی روشنی میں بھٹک رہا تھا لیکن شیریں زمین کی دھوپ کی طرح زمین پر کھڑی تھی۔

سلامت دوپہر کے بعد لوٹ آیا تھا لیکن کھانا کھا کر سو گیا تھا۔ شام کے وقت کریم اور ننھے آئے تو کریم نے جمیلہ سے چائے بنانے کو کہا اور ننھے کمپوزنگ والے کمرے کا دروازہ کھولتا ہوا کہنے لگا: ''کل کو کریم میاں! خواہ ہمارا بڑا سا پریس لگ جائے لیکن یہ کمرہ ہمیشہ یاد رہے گا۔''

اور ننھے جب کمرے کے اندر گیا تو اس کی نظر سامنے نئے کمپوز کیے ہوئے صفحوں پر پڑی تو وہ اونچی آواز میں سلامت کو آواز دیتا کہنے لگا: ''سلامت میاں! جواب نہیں تیرا۔''

سلامت پہلو کے کمرے میں نیند سے بیدار ہو گیا تھا۔ باہر آنگن میں آتا کہنے لگا: ''بھائی صاحب چھپتے چھپتے دو حروف ٹوٹے تھے، ابا سے پوچھنے میں نے فوراً بدل دیے تھے۔''

''ہاں میاں! راستے میں کسی نے مجھے وہ بھی بتایا تھا لیکن میں تو حیران ہوں —— تم نے دوپہر کو آ کر اتنے صفحے کمپوز بھی کر لیے...''

''نہیں تو۔'' سلامت نے کہا اور کمرے میں جھانک کر دیکھنے لگا...

سلامت بات کو پا گیا تھا لیکن اسے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کیا کہے۔

کریم نے ایک بار شیریں کو کھرے پر ہاتھ دھوتے دیکھا تھا یہ بھی لگا کہ وہ مل مل کر ہاتھوں سے کچھ اتار رہی ہے لیکن اس نے دوسرا کوئی اندازہ نہیں لگایا تھا لیکن اس وقت سلامت کی خاموشی سے وہ سب کچھ بھانپ گیا تھا کہنے لگا:

''پھر میں نجوم لگاؤں۔''

شیریں نے جمیلہ کے ہاتھ سے چائے کا گلاس تھام کر اسے دیتے ہوئے کہا: ''ابا! تم کب سے نجومی ہوئے ہو، خاموشی سے چائے پیو۔''

شیریں نے اپنی طرف سے باپ کو چپ رہنے کا اشارہ کیا تو کریم کا اندازہ یقین میں بدل گیا۔ کہنے لگا: ''نجوم تو سیکھا نہیں لیکن نجوم میں ایک علم قیافہ ہوتا ہے وہ میں لگا سکتا ہوں۔''

اور کریم نے بنجے کو کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: ''یہ لڑکی ہمیں پھر مات دے گئی۔''

''تمہارا مطلب ہے شیریں...'' بنجے نے کمرے میں سے باہر آ کر دروازے کے پیچھے چھپتی ہوئی شیریں کی طرف دیکھا تو سلامت اس کے پاس آ کر کہنے لگا:

''بھائی جان! مجھے اس نے قسم دلائی تھی کہ آپ کو نہیں بتانا وہ تو پہلے روز سے ہی مجھ سے کمپوزنگ سیکھنے لگی تھی —— پہلے والے صفحے بھی ہم نے مل کر کیے تھے۔''

بنجے سے کچھ بھی نہ کہا جا سکا۔ صرف شیریں کی طرف اس کا ہاتھ سلام کے پوز میں اٹھتا چلا گیا اور لگا —— جب دنیا میں کسی انسان نے پہلی بار کسی انسان کو سلام کیا ہوگا تو اس کی پوری زبان اس کے متحرک ہاتھ میں منتقل ہو گئی ہوگی۔

کریم نے آگے بڑھ کر شیریں کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا تو اس کی آنکھیں نم ہو گئیں اور کہنے لگا: ''ایک دن مجھے حسرت ہو رہی تھی کہ شیریں اور جمیلہ کی جگہ اگر آج بیٹے ہوتے...'' اور ساتھ ہی کریم نے ایک ٹھنڈی سانس بھری لیکن ایسی بیٹی دنیا میں کہاں ملے گی؟ یہ دنیا...''

شیریں نے کریم کی پگھلتی ہوئی چھاتی پر اپنا سر رکھ دیا۔ ''ابا! بس ایک بات کہنی ہے۔''

''کیا بیٹا؟''

''ایک مشین لا دو۔''

''مشین؟''

''وہی جو تم چلاتے ہو...''

''چھپائی کی مشین؟''

''وہی، اور مجھے سکھا دو۔''

''تم نے مشین مین بننا ہے؟''

کریم اونچی آواز میں ہنسنے لگا۔ ''برکت! باہر تو آؤ تمہاری بیٹی مشین مین بننے لگی ہے۔''

برکت کو پتہ نہیں تھا کہ شیریں نے کس طرح اندر بیٹھ بیٹھ کر پڑھنا سیکھ لیا تھا اور کس طرح کمپوزنگ سیکھی تھی۔ باہر دہلیز میں آ کر کہنے لگی: ''یہ تمہاری بیٹی جگ سے نرالی ہے، تم نے خود ہی اسے ایسا بنایا ہے، اب خود ہی اسے سنبھالنا۔''

آنے والے دنوں میں دوسرا فرما بھی پہلے کی طرح چھپ گیا۔ پروف بنجے نے دیکھے تھے۔ غلطیوں کے نشانات لگائے تھے۔ شیریں نے وہ غلطیاں درست کی تھیں۔ اب سلامت کی وارث میں کھڑے ہو کر کام کرنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اس نے دوسری بار پروف نکال کر خود ہی بنجے کو دکھا دیے تھے لیکن بنجے نے محسوس کیا کہ گھر کی ہوا میں کہیں تناؤ سا ہے۔

آج وہ تیسرے فرمے کے پروف دیکھ رہا تھا جس وقت کریم نے آ کر دو پتلے پتلے رجسٹر اس کے سامنے رکھ دیے ''تم ہر روز کہا کرتے تھے، میں حساب کتاب کے رجسٹر لے آیا ہوں۔''

بنجے نے دونوں رجسٹر دیکھے۔ ایک کیش بک تھی۔ ایک لیجر۔ کہنے لگا: ''یہی تو ہمارے تاج پریس کی ابتدا ہے، ابتدائے عشق۔''

سنتی ہو تاجی کی ماں! کریم نے اونچی آواز میں کہا تو پاس سے بنجے کہنے لگا: ''اس کے پہلے صفحے پر تاجی کا انگوٹھا لگوائیں گے۔''

نعمت پاس آ کر کہنے لگی: ''مجھے تو کوئی اعتراض نہیں، تمہارا جی چاہتا ہے تو لگالو مشین، یہ تو تمہاری ملکہ معظمہ ہی کہتی ہیں کہ گھر میں کھڑ کھڑ کی آواز نہیں ہونے دیں گے۔''

کریم نے بنجے کی طرف دیکھا۔ ''آدمی خدا کا انت تو پا سکتا ہے لیکن خدا کی مخلوق کا نہیں۔'' بنجے نے کہا کچھ نہیں، صرف ہنس دیا۔ لیکن یہ جان گیا کہ پچھلے کچھ دنوں سے گھر میں کیا کشمکش چل رہی تھی۔

کریم کہہ رہا تھا: ''لڑکی نے مشین کی بات کیا چھیڑی یہ دونوں اسی دن سے آپس میں الجھی ہوئی ہیں کہ گھر میں مشین نہیں لگانے دیں گے۔ وہ کیا کہتی ہے بھلا... گندم کا کھیت لڑکی کے پیٹ اور آدھا لہا میاں... روٹی کھاؤ... مشین کی رقم کہیں چھت سے گرے گی؟ یہ پہلے سے ہی جھگڑا ڈال کر بیٹھ رہی ہیں نجے کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر کہنے لگا: ''وہ بچی ہیں میاں...''

لیکن نجے کی بات کاٹ کر کریم بولا: ''نہیں تو بچی، سوچتی ہوں گی کہ مشین کی کھڑ کھڑ تو پہلے ہی رہتی ہے اوپر سے تیسری آ گئی تو...''

نعمت منہ میں پلو ڈال کر ہنس پڑی لیکن برکت نے کریم کو ترکی بہ ترکی جواب دیا: ''ہاں ہم قینچیاں بھی ہیں اور مشین بھی۔ ہمسایوں اور محلے داروں کی باتیں تمہارے کانوں میں نہیں پڑتیں وہ سنیں تو زبان خود ہی قینچی کی طرح چلنے لگتی ہے۔''

کریم نے گھور کر برکت کی طرف دیکھا اور کہنے لگا: ''خدا نے ہر چیز بنا رکھی ہے لوگوں کی زبان بنائی ہے اور کانوں میں دینے کے لیے روئی بھی بنائی ہے لیکن میں تو کہتا ہوں کہ مشین جانے سال بھر میں لگے گی یا دو سال میں، تم...''

''لفظ تم'' پر آ کر کریم کی آواز بہت تیز ہو گئی تو نجے نے بیچ میں بات کاٹ دی۔ ''میاں! تو یونہی تکرار کرتے ہو، مشین گھروں میں لگ ہی نہیں سکتی، اس کے لیے کمرشل ایریا چاہیے۔''

کریم نے پل بھر کے لیے سوچا پھر کہنے لگا: ''وہ نئی آبادیوں کی بات ہے۔ پرانی آبادیوں میں گھروں کے اندر لگی ہوئی ہیں۔''

''لیکن جو لگ چکیں، شاید اب نہ لگانے دیں۔''

وہ تو معلوم کر لیں گے۔ جب لگانی ہوگی۔ ابھی تو اس کی بات بھی ایک خواب ہے۔

''خواب تو نہیں... نجے کہنے لگا: ''آج میں نے تو تم سے بات کرنی تھی، وہ کتاب جس کا میں نے ترجمہ کیا ہے، اس کی اشاعت کی بات ہو رہی تھی، ایک غیر ملک کی ہے، انھوں نے ہر زبان میں چھپوائی ہے۔ اور چھپتے ہی کتابوں کا ایک تہائی تعداد خرید لیں گے اور وہ بھی پوری قیمت پر۔ میں نے حساب لگایا ہے، چھپائی کی پوری نہیں تو تین چوتھائی قیمت اسی وقت نکل سکتی ہے اور اگر سو پچاس کاپیاں مزید نکل سکیں تو لاگت پوری ہو جائے گی اور باقی پورا منافع ہے۔

''پھر تو مشین کے پیسے یہ رہے۔'' کریم جو چارپائی پر نیم دراز سا تھا اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''پوچھتے تھے تمہاری زبان میں کتنی کاپیاں بک جائیں گی؟ میرا خیال ہے چھ سات سو سے زیادہ نہیں بک سکیں گی سو میں نے کہا—— ''ایک ہزار چھپ جائے تو تین سو وہ لے لیں تو باقی ماندہ بک سکتی ہیں۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ کتاب مجھے بہت پسند ہے۔ اٹلی کے کسی علاقے کی کہانی ہے۔ جہاں انگوروں کی کھیتی کرنے والے مزدور نظام کے ظلم کے خلاف لڑتے ہیں۔''

کریم نے محبت سے نجے کی پشت پر ہاتھ رکھا اور کہنے لگا: ''نہیں جنا کسی بھی ماں نے تیرے جیسا لال، تمہاری جگہ ہمارے پریس کا مالک ہوتا تو کہتا کہ ہماری زبان میں دس ہزار بک سکتی ہیں اور پھر ساڑھے تین ہزار جو وہ خریدتے وہی چھاپ کر ان کے آگے رکھ دیتا اور چار گنا پیسے وصول کر کے جیب میں ڈال لیتا۔ کتاب کی قیمت لاگت سے پانچ گنا رکھتے ہیں۔''

''وہ کام کاج پریس میں نہیں ہو سکتا۔''

''وہ تو نہیں ہو سکتا... لیکن یہ بتاؤ یہ بات پکی ہے؟''

''ان کی طرف سے پکی ہے، وہ تو لکھ کر دینے پر تیار تھے، میں نے کہا تم سے مشورہ کر لوں۔''

''پھر مشین کا پتہ کریں؟''

''نہیں ابھی نہیں۔''

''کیوں؟''

''اسی طرح مشکل اٹھا کر دوسروں کی مشین پر چھاپ لیں پھر کوئی جگہ تلاش کر کے سوچیں گے۔ چلو یہ رجسٹر شروع کرتے ہیں۔ کتنے دنوں سے یہ چھوٹا موٹا خرچ ہو رہا ہے۔ سبھی لکھتے ہیں: ''لاؤ تاجی کو، اس کے انگوٹھے پر سیاہی لگا کر پہلے اس پر اس کے دستخط کروائیں۔''

کریم نے ایک طویل سانس کھینچی اور ہنس پڑا۔ لوگ تو اپنے رجسٹروں پر پہلے شیطان سے دستخط کرواتے ہیں کیوں کہ آگے جعلی رسیدوں کی رقم بھرنی ہوتی ہے۔ تمھیں ابھی پرسوں کی بات سناؤں، کسی مصور سے ہمارے مالک نے کام کروایا ہوگا۔ وہ پیسے لینے کے لیے آیا تو ساٹھ روپے دے کر اس کے آگے دو سو کی رسید رکھ دی دستخط لینے کے لیے، وہ تو اونچی اونچی شور مچانے لگا۔

''نجے ہنس دیا۔ میاں تم کس کس پر انگلی رکھو گے۔ کون ہے جو یہ کام نہیں کرتا؟''

''تمہارے تاج پریس پر انگلی رکھیں گے دیکھنا تم۔'' کریم نے کہا اور جمیلہ کی بانہوں میں بھری تاجی کے داہنے انگوٹھے کو سیاہی لگانے لگا۔

شیریں چپ چاپ آکر کریم کے پاس کھڑی ہوگئی اور جب کریم نے رجسٹر کے پہلے صفحے پر تاجی کا انگوٹھا لگوایا تو شیریں کہنے لگی: ''ابا! چاچا فتے کا سارا گھر خالی پڑا ہے، چاک تو ایک کونے میں ہے۔لگار ہے، دوسری طرف...''

''اوئے تم جیتی رہو۔'' کریم نے زور سے کہا: ''مجھے خیال ہی نہیں آیا یار! وہاں ایک کمرے میں مشین لگا لیتے ہیں۔''

''اگر وہ مان جائے تو... اسے پیسوں کی ضرورت ہے، ہر مہینے اسے کچھ کرایہ دے دیا کریں گے۔'' تجے کہہ رہا تھا، جب کریم چارپائی سے اٹھ کر کھڑا ہوا...

''اگر بات بن گئی تو پھر شیریں کو سلام عرض کرنا ہوگا...'' کریم نے ہنس کر تجے کو بھی اٹھالیا چل اُسے چل کر پوچھیں۔

وہ جب چلنے لگے تو شیریں ان کے پیچھے پیچھے آئی کہنے لگی: ''ابا! میں بھی آجاؤں؟''

''آؤ مشین مین جی! آپ آگے چلیے۔'' کریم نے ازراہِ مذاق کہا تو شیریں نے سچ مچ آگے بڑھ کر فتے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

''میرا عزت بیگ آیا ہے؟'' فتے نے آنگن میں چارپائی بچھاتے ہوئے کہا تو شیریں فتے کے کان کے پاس جا کر بولی: ''چاچا! اور ابا بھی آئے ہیں تمھیں نظر نہیں آئے؟''

فتہ اونچا نہیں سنتا تھا لیکن شیریں نے جب یوں بات کی جیسے وہ اونچا سنتا ہو تو فتہ بھی اس کی نقل اتارتا کہنے لگا: ''ہاں، کیا کہا؟ اور کون آیا ہے؟''

''اور فتہ سمیت سبھی کی ہنسی چھوٹ گئی۔''

کریم ذرا تفصیل سے فتے کی مشین والی بات سمجھانے لگا تو شیریں نے کہا—— ''فتے کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا، وہ بار بار پوچھ رہا تھا، کیسی مشین، کتنی بڑی مشین ہوتی ہے؟ تو شیریں بول پڑی'' چاچا! تم یہی سمجھ لو جتنا بڑا تمہارا آوا ہے، جس میں تم کچے برتن پکاتے ہو، بس وہ بھی آوے جیسی ہی ہوئی، جس میں حرف پکاتے ہیں... جو کچھ لکھا ہوتا ہے کاغذوں پر...''

''اچھا'' اچھا فتے نے کہا: ''پھر تم یہاں بیٹھ کر لفظ پکاؤ گے۔''

تجے نے چونک کر شیریں کی طرف دیکھا تو اسے لگا—— اس کی اپنی نظر آنکھوں میں منجمد ہوگئی ہے۔

کریم بھی مسکرا دیا اور تجے کی طرف دیکھتا کہنے لگا: ''مجھے عمر ہوگئی مشین چلاتے لیکن کچے حرفوں کو پکانے کی بات نہیں سوجھی تھی۔''

''یہ تو بس ادیب کو بھی نہیں سوجھ سکتی۔'' تجے نے کہا اور نظر نیچی کر لی۔

شیریں فتے سے کہہ رہی تھی: ''ہاں چاچا! یہاں تمہارے پاس بیٹھ کر پکائیں گے... ابا تم سے یہی پوچھنے آیا ہے۔''

فتے نے لڑکی کی پیٹھ پر ایک دھول جمائی اور کہنے لگا: ''تو اس بات کے لیے تم باپ کی سفارش کرنے آئی ہو؟ تم تو میری سلمیٰ بیٹی ہو، جو مشین تم نے لگانی ہے لگاؤ۔''

وہ تینوں جس وقت فتے کے گھر سے لوٹ رہے تھے تجے نے شیریں کے قریب ہو کر کہا: ''لگتا ہے اب مجھے نئے نئے کچھ الفاظ لکھنے ہوں گے۔''

شیریں نے دونوں آنکھیں اٹھا کر ایک بار تجے کی طرف دیکھا اور پھر نگاہ دوسری طرف کر لی۔ لیکن تجے کو محسوس ہوا—— ان نظروں میں کچھ تھا جو ادھر اس کے پاس ہی رہ گیا ہے۔

چاروں طرف پھیلا ہوا اندھیرا تھا۔ لیکن یہ اندازہ نہیں کہ رات کا کون سا پہر تھا۔ اندھیرے کو رہ رہ کر ہلاتی ایک آواز ضرور تھی ''جاگتے رہو۔'' لیکن پھر دم بھر کے لیے اس آواز کے ہونٹوں پر وہی اندھیرا اپنی ہتھیلی رکھ دیتا تھا اور وہ چپ چاپ ہو جایا کرتی تھی۔

تجے بھی اندھیرے کے ایک ٹکڑے کی طرح اپنے دیوان پر بے حس پڑا رہا... لگا اس کی چھاتی میں بھی کوئی چیز اٹھ کر کہہ رہی ہے—— 'جاگتے رہو' اور پھر اس کے اندر سے کہیں ایک ہاتھ اٹھا کر اس آواز کے ہونٹوں پر ہتھیلی رکھ رہا تھا۔

جی چاہا—— ابھی کمرے کی سیڑھیاں اتر کر نیچے سڑک پر چلا جائے اور ایک لالٹین لیے خالی سڑک پر گھومتے چوکیدار سے پوچھے'' تم نے کبھی ان لوگوں کے چہرے دیکھے ہیں جن سے ڈر کر تم ہر شب لوگوں کو جاگتے رہنے کا مشورہ دیتے ہو؟''

لیکن وہ جوں کا توں دیوان پر پڑا رہا۔

اس کا ہاتھ اپنے سینے پر تھا۔ انگلیاں دھیرے دھیرے ہلنے لگیں چھاتی آہستہ سے گدگدائی۔ شاید ہونٹوں کا وہی سوال سینے سے پوچھ رہی تھیں—— کس سے ڈر کر جاگنا ہے، کس سے؟ یہاں اتنے اندھیرے میں کون آئے گا؟ کون آئے گا؟... کون؟

لگا ـــــ سینے میں کچھ ہل رہا ہے، کوئی چیز، جیسے کوئی اندھیرے میں کسی چیز کو چھپا کر رکھتا ہو۔ بنجے کی سانسیں مختصر اور گراں ہو گئیں ـــــ شاید اندر پڑی ہوئی کسی شے کے بوجھ سے۔

باہر سے چوکیدار کی آواز پھر آئی ـــــ 'جاگتے رہو'

بنجے جاگ رہا تھا ـــــ لیکن پھر بھی کچھ تھا جو اس کے اندر باہر سے آ گیا تھا، وہ جانے وہاں پر کیا رکھ رہا تھا ـــــ جہاں سے وہ کچھ نکال رہا تھا۔

اس نے تھک کر آنکھیں موند لیں۔

لیکن وہ جاگ رہا تھا ـــــ لگا، وہ آنکھوں کو بزور بند کر رہا ہے اور کانوں کو بھی...

اس کے ہونٹوں نے ایک بار اس کے کانوں کے قریب ہو کر کہا ـــــ ''شیریں''، لیکن اس نے سنا نہیں۔

سینے میں پھر کچھ بوجھل سا محسوس ہونے لگا۔ اس نے ہتھیلی کے ساتھ حلق سے لے کر نیچے سینے تک سارے گوشت پوست کو ٹٹولا...

ہتھیلی دھیرے سے کانپ گئی ـــــ جیسے جو کچھ سینے میں تھا وہ ایک بار ہتھیلی سے مس ہوا ہو۔

اس کا ہاتھ سینے سے ہٹ کر دیوان کے کنارے تک چلا گیا اور پھر نیچے ایک خلا میں لٹک گیا۔

یہ کھلی رات کے دن تھے جب نیم کی پتیاں جھڑتی ہیں۔ بنجے کے کمرے کی کھلی کھڑکی میں باہر کے پیڑ کی پتیاں جھڑ جھڑ کر ہر روز اس کے کمرے کے فرش پر بچھ جاتی تھیں۔ آج بھی جب بنجے نے کروٹ بدلی۔ دیوان کے کنارے سے نیچے خلا میں جھانکتا اس کا ہاتھ نیم کی پتیوں کو چھونے لگا۔

شیریں... لاشعوری طور پر بہت اونچی آواز میں اس کے منہ سے نکلا ـــــ شیریں اس کے بازو کے پاس کھڑی ہے اور اس کی اپنی ہتھیلی شیریں کے بدن کی سیاہ قمیص کے چکن کے نقش ونگار پر پڑ رہی ہے۔

باہر سے چوکیدار آواز آ رہی تھی ـــــ جاگتے رہو۔

لیکن وہ سو نہیں رہا تھا...

بنجے نے مٹھی میں آئی نیم کی پتیوں کو آہستہ سے ہتھیلی میں سہلایا ـــــ اور جیسے سیاہ قمیص کی چکن کی بوٹیاں اس کی پوروں کے درمیان کپکپانے لگی ہوں...

بنجے جانتا تھا ـــــ پچھلے دو دنوں سے وہ کچھ بھی نہیں لکھ سکا تھا۔ کریم کے گھر بھی نہیں گیا تھا۔

لکھنے کے لیے وہ جس وقت بھی کاغذ سامنے رکھتا۔ شیریں کی وہ کچے الفاظ والی بات یاد آ جاتی...

وہ بات شیریں نے جانے کس بھولپن میں کہی تھی لیکن بنجے نے جس وقت سنی تھی اس وقت سے اس کے کانوں میں گنگنا رہی تھی...

تقدیر کا ایک فیصلہ بن کر...

لگ رہا تھا ـــــ وہ جب بھی اور جو بھی لکھے گا ـــــ سبھی کچے الفاظ ہوں گے۔ شیریں جب نہیں ہوگی ـــــ کتابیں جب بھی چھپیں گی۔ لیکن بنجے کو لگ رہا تھا چھپی ہوئی کتابوں میں بھی کچھ ہوگا، جو کچے الفاظ کی صورت میں ہی رہے گا۔

بات صرف پرنٹنگ پریس لگانے کی تھی۔ سامنے کمہار کی کارگاہ تھی ـــــ مٹی، چاک اور آوا۔ اور انہی چیزوں کی مماثلت سے کم بخت نے کتنی بڑی بات کہہ دی تھی ـــــ کتابوں کی پوری تاریخ میں یہ بات کسی دوسرے نے نہیں کہی ہوگی ـــــ ''چاچا! تم یہی سمجھ لو جس طرح تمہارا آوا ہے، جس میں تم کچے برتن پکاتے ہو، بس وہ بھی آوے جیسی ہے اس نے لفظ پکانے ہیں...''

بنجے خود سوچتا اور خود ہی اس خیال کو دیکھتا رہ جاتا۔

کل ایک بار بنجے کی آنکھوں میں نمی سی بھی تیر گئی تھی۔ کم بخت! آسمان جیسی باتیں تو دنیا میں صاحبانِ علم ہی کرتے ہیں لیکن تم نے یہ مٹی جیسی باتیں کہاں سے سیکھ لی ہیں؟ یہ باتیں تو کوئی عالم و فاضل کر سکتا ہے۔

اور کل سے بنجے کو اپنے آپ سے ہول سا آنے لگا تھا ـــــ میں جب بھی کچھ لکھوں گا، وہ چھپے گا لیکن اس میں ہمیشہ کچھ ایسا بھی ہوگا ـــــ جو کچے لفظوں جیسا رہ جائے گا۔

یہی کچھ بنجے کی گرفت میں نہیں آ رہا تھا... لگا اس وقت رات کے تاریک پہر میں ضرور وہی کچھ ہے جو کوئی اس کی چھاتی میں چھپا کر رکھ رہا ہے شاید اس کا اپنا ہی ہاتھ۔

صبح ہوئی کام پر جاتے ہوئے کریم اس طرف بھی آیا بس اتنا کہنے کے لیے ''یار! تم گھر جا کر پروف دیکھ لینا، فرما کا ہوا ہے۔ لیکن بنجے سے اٹھا نہیں گیا۔

اب کافی دن چڑھ آیا تھا۔ لوگوں کو جاگنے کا سندیس چوکیدار کی آواز اب کہیں نہیں تھی۔ لیکن بنجے کے سینے میں کہیں ایک اندھیرا تھا جس کے کسی گوشے میں سے کوئی اس وقت بھی اسے جاگتے رہنے کے لیے کہہ رہا تھا۔

چوکیدار معمول کے مطابق قریب کے ہوٹل سے ننھے کے لیے چائے اور روٹی لے آیا تو ننھے نے غسل خانے میں جا کر کپڑے بدلے، باہر آ کر روٹی کھائی اور پھر ایک بار شیشے میں اپنی آنکھوں کی طرف دیکھ کر سائیکل لے کر کریم کے گھر کو چل دیا۔

کریم کی گلی والا موڑ مڑا ہی تھا کہ اپنی چوکھٹ میں کھڑے فتّے نے اسے آواز دے دی۔

''میاں عزت بیگ! صبح سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں، آج آوے میں برتن چڑھانے تھے۔ کل کریم کو پیغام بھی دیا تھا۔''

کریم نے اپنی سائیکل فتّے کی ڈیوڑھی میں رکھ دی۔ کل تو میں آیا ہی نہیں تھا دوست! اسی لیے تمہارا پیغام نہیں ملا۔

اور ننھے نے اندر آنگن میں داخل ہوتے پوچھا: ''تو چڑھا دیے برتن آوے میں؟''

کب کے، اب تو باہر بھی نکال لیے ہیں... صبح سے میری بیٹی آئی ہوئی ہے میری مدد کے لیے... فتّے نے کہا تو ننھے نے دوسرے کونے میں شیریں کو آوے سے نکالے ہوئے برتن جوڑتے دیکھا۔

''دیکھا! میری بیٹی نے پیالوں پر کس طرح کے بیل بوٹے بنائے ہیں...''

فتّے نے آگے ہو کر کئی پیالے فرش سے اٹھا کر ننھے کو دکھائے کیسے لگ رہے ہیں تمھیں؟

جی چاہتا ہے، ہر پیالے میں پانی ڈال کر پیوں، ننھے نے آنگن میں چارپائی پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا اور فتّے نے شیریں کی طرف دیکھا، لا بیٹی اس پیالے کو سُچا کروائیں۔

ننھے کی آنکھیں پگھل کر فتّے پر بہہ نکلیں لیکن وہ بولا نہیں لیکن اپنے اس ثقافتی ورثے پر اسے پیار آنے لگا —— جہاں لوگ برتن کے جھوٹا ہونے کے بجائے سُچا ہونا کہتے ہیں۔

فتہ ایک وہ پیالہ پکڑ کر شیریں کی طرف بڑھا رہا تھا جس پر اس کے حساب سے زیادہ نقش ونگار بنے تھے۔ لیکن شیریں کے ہاتھ میں دوسرا پیالہ تھا اور وہ کہہ رہی تھی: ''نہیں چاچا! یہ زیادہ خوب صورت ہے۔''

اچھا، جو تمھیں خوب صورت لگے... فتّے نے اپنے ہاتھ والا پیالہ نیچے رکھ دیا اور شیریں نے اپنے ہاتھ میں تھامے ہوئے پیالے کو گھڑے میں سے پانی بھر کر باہر لے آئی۔

ننھے نے بھرا ہوا پیالہ لے لیا اور دو گھونٹ لے کر اس کے نقش ونگار دیکھنے لگا۔

اور نظر نقش ونگار سے پھسل کر ادھر کھڑی شیریں کی طرف چلی گئی۔

شیریں کی فراخ اور سیاہ آنکھوں نے صرف ایک بار غور سے ننھے کی طرف دیکھا اور پھر آنکھیں ہٹا لیں پوچھا: ''اور پانی دوں؟''

''چائے رکھ دے بیٹی، اب پانی ہی پلاتی جاتی رہوگی؟'' فتّے نے کہا اور خود اندر جا کر چولہے پر چائے کا پانی رکھنے لگا۔

ننھے نے جواب نہیں دیا، صرف شیریں کی طرف دیکھتا رہا...

شیریں کو یوں کھڑے رہنا، شاید مشکل لگ رہا تھا، ایک اور پیالے میں پانی ڈال کر لے آئی پھر پوچھا: ''اور پانی دوں؟''

ننھے نے ہاتھ میں تھامے ہوئے پیالے کے پھولوں میں اس جگہ اشارہ کیا —— جہاں شیریں نے پھول بوٹے بناتے وقت دو حرف بھی لکھ دیے تھے 'میتا' اور ننھے نے شیریں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ''تم مجھے بیت چکے کل کے پیالے میں آنے والے کل کا پانی پلاؤ گی؟''

شیریں نے نگاہ نیچی کر لی۔ جواب نہیں دیا لیکن جب سر اٹھا کر ایک بار ننھے کی طرف دیکھا —— اس کی آنکھوں میں درد بھرا ہوا تھا۔

آٹھواں فرما چھپنے والا تھا، جس شام ننھے اس کے آخری پروف دیکھنے آیا۔ کریم کے پاس بیٹھتے ہوئے ایک اخبار اس کے آگے رکھ کر کہنے لگا۔

''یہ دیکھو میاں!''

کریم نے اخبار لے لی، الٹی پلٹی، لیکن پھر چارپائی پر رکھتا کہنے لگا: ''لڑکوں لڑکیوں نے بھی یہ کافروں کی زبان سیکھ لی لیکن مجھے نہ آئی کیا لکھا ہوا ہے اس میں؟''

''وہ میرا ناول چھپ رہا تھا نا قسط وار۔''

میرے اندازے کے مطابق اس کی ساری قسطیں چھپ چکی ہیں... اس لیے اب اپنی زبان میں شروع ہوئی ہیں...

لیکن یہ اخبار تو کوئی اچھا نہیں لگتا۔ بہت خراب کاغذ ہے، موٹے موٹے عنوانات...

یہ اچھا ہے کہ تم دیکھ سکتے ہو پڑھ نہیں سکتے۔

یہ بھی ناول کو چھاپنے لگے ہیں؟

ناول نہیں میاں...گالیاں...اور وہ بھی قسط وار لکھا ہوا ہے باقی گالیاں اگلے ہفتے...

حرام کے تخم...کریم کے منہ میں موٹی سی گالی آگئی تو بنجے کہنے لگے تم میاں اپنی زبان کیوں میلی کرتے ہو، یہ کام انہی کے لیے رہنے دو۔"

لیکن کہتے کیا ہیں؟

کہتے ہیں—— یہ ناول ضبط ہو جانا چاہیے۔

وہ کیوں؟

اس میں دوزخ کا جو ذکر ہے اس کے سبب۔ کہتے ہیں اس میں حکومت کے خلاف بغاوت کی گئی ہے۔ دوزخ کا نام لے کر حکومت کے افسروں کی توہین کی گئی ہے۔

پھر تو سچ ہی کہتے ہیں...کریم نے کہی تو ہنسنے لگا۔

اگر ضبط نہ کریں گے تو دوزخ کا ثبوت کیسے دیں گے؟ تم خود ہی سوچو میاں! اگر وہ لوگوں کو زمین پر جنت کا خواب دیکھنے کی اجازت دے دیں تو پھر یہ دوزخ کیسا؟

بنجے نے مسکرا کر کریم کے چہرے کی طرف دیکھا اور کہنے لگا—— میں سوچتا ہوں—— ابھی مشین نہ لیں، کون جانے ناول سچ مچ ہی ضبط ہو جائے اور سارا نقصان ہمیں اٹھانا پڑے پھر مشین کی قسطیں بھی ادا کرنی ہوں گی، پھر اگر تم نے نوکری چھوڑ دی تو اور مشکل ہو جائے گی۔

بنجے جب یہ کہہ رہا تھا تو اس وقت شیریں جو دور کھڑی سب کچھ سن رہی تھی پاس آگئی۔ کہنے لگی: "ابا کو ہم نوکری چھوڑنے دیں گے، مشین میں چلاؤں گی۔"

کریم نے جواب نہیں دیا۔ بنجے نے دیا، تم نے ساری بات سنی ہے؟ یہ ناول شاید ضبط ہو جائے گا۔"

ہو جائے...شیریں نے کہا...اور باپ کو مخاطب ہوتی کہنے لگی: "بس تم اتوار کے روز مجھے سکھا دیا کرنا، دو چار بار سکھاؤ گے تو میں خود ہی چلانا سیکھ جاؤں گی۔"

کریم ہنس پڑا، اچھا، اچھا تمھیں بہت جلدی ہے تو چلو تمھیں کسی پریس میں مشین مین بنا دیتے ہیں۔

شیریں کی آواز کچھ تن گئی۔ ایسی آواز کریم نے کبھی پہلے اس کے منہ سے سنی تھی نہ بنجے نے۔ وہ کہہ رہی تھی، میں نے کسی کی نوکری نہیں کرنی اور نہ ہی عمر بھر تم سے کچھ اور طلب کروں گی۔

کریم نے قدرے چونک کر شیریں کی طرف دیکھا لیکن کہا کچھ نہیں۔

بنجے نے کہا—— لیکن تمھیں اندازہ ہے کہ کتاب کے ضبط ہونے سے کتنا نقصان ہوگا؟

صرف کاغذ کا نقصان، جو خریدا جا چکا ہے...

تمہاری اور سلامت کی ساری محنت؟

اس کا کیا ہے؟ وہ تو ہم نے تربیت حاصل کی ہے۔

میری ساری محنت؟

جس نے ناول لکھ لیا، اس کی محنت پوری ہو گئی۔ اخباروں میں گالیاں دینے والے تو یہ ناول نہیں لکھ سکتے۔

اب بنجے نے جواب نہیں دیا، ایک بار شیریں کی طرف دیکھا، پھر نظر دوسری طرف کر لی۔

شیریں نے پروف سامنے رکھ دیے اور خود اندر چلی گئی۔

بات سنو! کریم نے کہا، وہ دوسری کتاب مل گئی ہے چھاپنے کے لیے، وہ جس کا تم نے ترجمہ کیا تھا؟

ہاں وہ تو مل چکی ہے...

ایک کام اور بھی کر لیں۔

کیا؟

ہم اپنے صوفی شاعروں کا کلام مجتمع کر کے ضرور چھاپیں، وہ میری عمر بھر کی حسرت۔

وہ تم تلاش کرو۔ پھر اس میں سے اچھے اچھے شعر لے کر انتخاب مرتب کر لیں گے اور اگر تم کہو تو۔

کیا؟

ابھی یہ ناول درمیان میں روک دیں؟

بالکل نہیں، بلکہ جو دوسری زبانوں والے مانگ رہے ہیں انھیں چھاپنے دو۔

بنجے خموشی سے پروف پڑھنے لگا۔ کافی اندھیرا ہو گیا تھا۔ جب پروف ختم ہوئے تو بنجے سارے کاغذ کریم کے حوالے کرتا کہنے لگا۔ تمہاری بات بالکل درست ہے۔ اگر ملک کی ترقی اور عوام کی بہبود کے لیے اٹھائی ہوئی آواز کو ضبط نہ کیا جائے تو پھر وہ دوزخ کیسی ہوئی؟

ہاں میاں! تم نے جو کچھ لکھا ہے، وہی سچ ہو رہا ہے... کریم نے کہا اور ہنسنے لگا۔ ادیب تو میاں خود پیغمبر ہوتا ہے۔

موسم بدل چکا تھا، پچھلے موسم گرما میں شیریں اور بنجے نے جو پودے لگائے تھے انھیں نئے موسم نے نئی ہریالی پہنا دی تھی۔ موتیے کے پتوں میں کوئی کوئی سفید کلی نظر آنے لگی تھی، آڑوؤں پر کوئی کوئی نیلا پھول اور انار کے پودے پر گہرے سرخ پھول...

لیکن زندگی کے جس گوشے سے وہ گہرا کالا بادل اٹھا تھا—— کہ جس نے یہ افواہ پھیلائی تھی کہ بنجے کا ناول ضبط ہو جائے گا، ابھی تک سب کے سروں پر اُمڈا ہوا تھا، دریں اثنا ایک اور گوشے سے ایک دوسری گرج کے ساتھ ابر کی فوج نے ہلّہ بول دیا۔

کریم نے شام کے وقت شیریں کو اشارے سے بلا لیا اور کہا: ''چاچا فتّے تمھیں بلا رہا تھا۔ تم چلو میں بھی آ رہا ہوں، اور جب شیریں اس کے گھر کی طرف چل دی کریم اس کے پیچھے پیچھے تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس کے ساتھ جا ملا۔ اور کہنے لگا: ''فتّے کے گھر نہیں میرے ساتھ چلی آؤ۔''

وہ دونوں گلی کے پہلو والی دیوار کے طرف سے ہو کر جب پچھلے کھنڈروں تک پہنچ گئے تو کریم نے کہا—— تم سے کچھ کہنا ہے لیکن گھر کے کسی فرد کے سامنے کہنا ممکن نہ تھا۔

کریم کھنڈروں کی ایک دیوار سے لگے ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور شیریں سے بھی بیٹھ جائے کو کہا اور بولا—— یہ میں جانتا ہوں کہ تم جھوٹ نہیں بولتی لیکن جو کچھ بھی تمہارے من میں ہے وہ مجھ سے مت چھپانا، مجھے سچ سچ بتا دو کہ تمہارے دل میں کیا ہے؟

کیا بات ہو گئی ابا؟ میرے من میں کچھ نہیں...

تم ایک ہی بات پر اڑی ہو کہ مشین لگائی ہے...

لیکن وہ تو تمہارا ہی خواب ہے ابا، تاج پریس کا...

میرا تو ہے لیکن تم جو کہتی ہو کہ مشین تم چلاؤ گی، وہ کیوں؟

کیوں؟ لڑکیاں مشین نہیں چلا سکتیں؟

وہ بات نہیں لیکن تم نے اس دن کہا کہ ابا مشین لگا دو، پھر میں تم سے زندگی میں کچھ نہیں مانگوں گی۔

ہاں کہا تھا...

تم عمر بھر مشین چلاؤ گی؟

ہاں، میں تاج پریس چلاؤں گی۔

لیکن جب تم نکاح کر کے چلی جاؤ گی تو تاج پریس کیسے چلاؤ گی؟

شیریں پل کے لیے چپ ہو گئی پھر کہنے لگی: ''ابا! تم نے کہا نا سچ کہنا، اس لیے سچ کہتی ہوں کہ میں نکاح نہیں کروگی۔

کریم چپ ہو کر شیریں کی طرف دیکھتا رہا جیسے پل کے لیے رینگتے اندھیرے میں اس کے نقش زیادہ صاف نظر نہیں آ رہے تھے۔

پھر کہنے لگا—— تم جانتی ہو آج صبح مولوی میر محمد نے مجھے بلوا کر کیا کہا تھا؟

کیا؟

تمہارے نکاح کی بات کرتا تھا...

لیکن اس سے کس نے کہا تھا نکاح کرنے کو؟

کریم کسی سوچ میں کھو گیا پھر کہنے لگا، وہ بھی میں تمھیں بتا دوں گا لیکن پہلے تم مجھے بتاؤ کہ تم نکاح کیوں نہیں کرو گی؟

شیریں نے کچھ دیر جواب نہیں دیا پھر ہنسنے لگی۔ سیدھی سی بات، مجھے تاج پریس جو چلانا ہے۔

کریم نے اپنا ہاتھ شیریں کے سر پر رکھ دیا اور کہا—— میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ جو کچھ تمہارے من میں ہے وہ مجھ سے مت چھپانا۔

شیریں باپ کے منہ کو تکنے لگی اور اپنے سر پر رکھے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ سے ذرا سرکاتے ہوئے کہنے لگی: ''اس کا مطلب ہے تم مجھے اپنی قسم دلا رہے ہو...''

کریم نے لڑکی کے ردِعمل کو سمجھ لیا تھا، کہنے لگا: ''چلو یونہی سمجھ لو۔''

میں بھی اپنی قسم دے دوں کہ یہ بات مجھ سے نہ پوچھنا تو؟

کریم کو لگا—— کہ لڑکی اپنی عمر سے زیادہ بڑی ہو گئی ہے کہنے لگا: ''بیٹا! لڑکیاں جب جوان ہو جاتی ہیں تو ایک طرح سے وہ برابر کی ہو جاتی ہیں۔ پھر لڑکوں لڑکیوں سے وہ رشتہ نہیں رہتا پھر ماں باپ بھی ان کے دوست ہو جاتے ہیں...

پھر میری قسم کھاؤ کہ تم کسی سے نہیں کہو گے۔

نہیں کہوں گا۔

کسی کو بھی نہیں۔

اگر یہ بات مجھ سے پوشیدہ ہوتی تو میں گھر ہی میں بیٹھ کر تیری اماں کے سامنے ہی تجھ سے پوچھ لیتا...

میں اماں کی بات نہیں کرتی، یہ میں جانتی ہوں تم اسے نہیں بتاؤ گے۔

پھر اور کسے؟

تم کبھی اپنے دوست کو بھی نہیں بتاؤ گے۔

نجے کو؟

ہاں...

اگر تم کہو گی تو نہیں بتاؤں گا۔

شیریں پھر چپ ہو گئی۔

تمھیں مجھ پر اعتبار نہیں آیا؟ کریم نے کہا تو شیریں جلدی سے بول پڑی ابا! مجھے صرف تم پر ہی تو اعتبار ہے اور کسی پر نہیں۔

پھر؟

بات یہ ہے کہ نہ کوئی میری غلطی نہ کسی اور کی، غلطی تو اللہ میاں سے ہو گئی ہے...شیریں کہہ گئی لیکن پھر جانے اپنے ہی الفاظ سے کچھ گھبرا گئی اور کہنے لگی: ''چلو گھر چلیں، آج نہیں پھر کبھی بتاؤں گی۔''

نہیں شیریں...کریم اٹھا نہیں کہنے لگا: ''بستی والوں نے دوٹوک فیصلہ مانگا ہے ورنہ مجھے ڈر ہے۔ وہ کوئی اچھی بُری حرکت نہ کر بیٹھیں۔''

اس سے پہلے قتے نے بھی شیریں کو اسی طرح کسی بات کا احساس دلایا تھا، اس لیے وہ زیادہ حیران نہیں ہوئی تھی کہنے لگی—— ابا! ہم کسی اور جگہ جا کر رہ سکتے؟ مجھے یہاں کے لوگ اچھے نہیں لگتے۔

کریم کے اندر سے ایک درد اٹھ کر اس کے ہونٹوں پر آ گیا—— تم یہ بھول گئی ہو کہ غریبوں کے لیے ساری بستیاں ایک جیسی ہوتی ہیں۔

لیکن انھیں ہم سے کیا شکایت ہے؟ ہم انھیں کیا کہتے ہیں—— ابا! تم بھی ان سے ڈرتے ہو۔

شیریں نے یہ کہا تو کریم نے اس کے سر کے گرد بازو حمائل کر کے اسے اپنے گھٹنوں سے لگا لیا کہنے لگا: ''میں اپنے لیے نہیں ڈرتا لیکن اگر نجے کو کچھ ہو گیا تو میں کیا کروں گا؟''

شیریں نے باپ کے گھٹنوں سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا——

''میں جبھی تم سے کہتا ہوں کہ تم مجھے اپنے دل کی سچی بات بتا دو۔'' کریم نے کہا تو شیریں نے پھر آہستہ سے سر اس کے گھٹنوں سے ٹکا دیا۔ کہنے لگی: ''اللہ میاں سے یہی غلطی ہو گئی کہ اس نے مجھے شیریں بنا دیا، جتا نہیں بنایا۔''

کریم کے رگ و ریشے میں پھر ایک روح دوڑ گئی۔ کہنے لگا: ''اگر وہ تم سے نکاح کرنے پر تیار ہو جائے تو؟''

شیریں کی ساری جان اس کی آنکھوں میں سمٹ آئی اور وہ باپ کے منہ کو تکنے لگی۔ ''یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟''

''پتہ نہیں...'' کریم کی آواز سوچوں میں ڈوبتی گئی اور کہنے لگا: ''بستی والے کہتے ہیں... کہ یا تو شیریں کا کہیں نکاح کر دو یا نجے کو اپنا مذہب بدل لے اور شیریں سے نکاح کرے۔''

''نہیں ابا...نہیں...شیریں نے جیسے تڑپ کر کہا...میں کب کہتی ہوں...''

کریم نے جلدی سے کہا: ''اس سے تو یہ بات کہنا بھی کفر ہے، میری زبان نہ کٹ جائے گی یہ بات کہتے۔''

اور کریم کچھ سوچتا ہوا شیریں سے پوچھنے لگا—— لیکن ایک بات بتاؤ، تم نے خود ہی یہ سوچا ہے یا نجے کو بھی بتایا ہے؟''

''نہیں ابا نہیں۔''

''اسے تمہارے دل کا حال معلوم نہیں۔'' کریم نے پوچھا۔

''نہیں۔''

''پھر میں اس سے کیا کہہ سکتا ہوں۔'' کریم چپ سا ہو گیا۔

''لیکن میں نے کب کہا ہے—— کچھ کہنے کے لیے...'' شیریں نے کہا تو کریم سوچ

میں پڑ گیا۔ ''اگر اسے تم سے کوئی لگاؤ نہیں، پھر تم عمر بھر کیا کرو گی؟''

''پریس چلاؤں گی...'' شیریں نے کہا تو کریم کو آنسو بھری ہنسی آ گئی۔ منہ سے نکلا:

''پاگل لڑکی۔''

''تم پر گئی ہوں ابّا۔'' شیریں ہنس پڑی۔ اس نے اور کچھ نہیں کہا لیکن کریم کے لیے —— وہ اپنی بات سے بہت کچھ کہہ گئی تھی۔

ساری بات کریم کے دل میں طرح طرح کے خیالات ستاروں کی طرح طلوع ہوتے اور ڈوبتے رہے رُت بدل گئی تھی لیکن ابھی کسی نے چارپائیاں باہر نہیں نکالی تھیں۔ سبھی اپنی اپنی کوٹھریوں میں سوئے ہوئے تھے لیکن کریم باہر آنگن میں چارپائی ڈال کر لیٹ گیا تھا۔

اس نے گھر میں برکت اور نعمت سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ اس لیے وہ دبے پاؤں چارپائی سے اٹھتا اور بیٹھتا رہا اور کسی کو اس کی کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ صرف شیریں نے نصف شب کو اٹھ کر باہر باپ کے پاس آ کر دھیرے سے کہا: ''ابا! تم میری فکر نہ کرو۔ آرام سے سو جاؤ، کچھ نہیں ہوتا۔''

''مجھے تمہاری فکر نہیں ہے لڑکی... لیکن یہ لوگ... کئی ان میں شریف بھی ہیں لیکن کئی بڑے حرام زادے...'' کریم نے اپنا منہ بند کر لیا۔ لڑکی کے سامنے اس کی زبان پر آئی گالی شرمندہ ہو گئی...

مجھے بھی گلی سے گزرنا اچھا نہیں لگتا۔ ابا تم اس عقبی دیوار میں ایک دروازہ نکلوا دو —— عقبی جانب تو کوئی نہیں رہتا، خالی جگہ ہے، وہ بھی ادھر سے... کہتے کہتے شیریں کچھ شرما گئی۔

''ان باتوں سے کچھ نہیں ہوتا بیٹی، آباد گلی میں تو پھر چار آدمی ہوتے ہیں۔ پچھلی طرف سے گزرتے کو خواہ کوئی آرام سے ذبح کر دے ——'' کریم نے کہا تو شیریں کا منہ ٹوٹتے تارے جیسا ہو گیا۔

''جاؤ تم جا کر سو جاؤ... نہیں تو دونوں جاگ پڑیں تو باہر آ جائیں گی...''

شیریں دوبارہ کمرے میں چلی گئی لیکن کریم کی رات برس بھر لمبی ہوتی نظر آ رہی تھی کہ گزرنے میں ہی نہ آتی۔

پو پھٹتے ہی شیریں کو جگا کر اس نے چائے پی اور سائیکل نکالتا کہنے لگا: ''اماں سے کہہ دینا

آج علی الصبح ہی کو کام تھا۔''

''ابا...'' شیریں چوکھٹ کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ ''تم کہاں جا رہے ہو؟'' ''اس کی طرف، دل نہیں مانتا... یوں ہی اس کے پاس جا کر بیٹھوں گا۔''

''لیکن اس سے یہ بات نہ کہنا۔''

کریم نے اثبات میں سر ہلا دیا اور چلا گیا۔

سڑک پر بڑی دور تک وہ سائیکل کو تیزی سے چلاتا رہا لیکن پھر بریک لگا کر سائیکل سے اتر گیا۔

کچھ دیر تک سائیکل کا ہینڈل تھامے پیدل چلتا رہا لیکن نجے کے گھر والا موڑ قریب آیا تو پاؤں بالکل منجمد سے ہو گئے۔

''یا خدا! کون سا وقت آ گیا ہے...'' کریم کے منہ سے نکلا اور وہ سوچنے لگا: ''دنیا بھر کی باتیں اس سے کر لیتا تھا، بلا جھجک، اپنے دل کی وہ باتیں بھی جو اور کسی سے نہیں کر پاتا تھا... اور پاؤں کی طرح اس کی سوچ بھی تھم گئی، لیکن یہ بات اس سے کیسے کہہ پاؤں گا؟''

کریم نے سائیکل واپس موڑ لی لیکن ابھی طے کی ہوئی مسافت کو دوبارہ طے کرتا سوچنے لگا: ''میں اس سے کچھ بھی چھپا کر نہیں رکھ سکتا... اگر دنیا دشمن ہو گئی ہے تو اگر اسے نہیں کہوں گا تو اور کس سے کہوں گا؟''

کریم نے پھر ایک رو میں آ کر سائیکل موڑ لی۔ لیکن سوار نہیں ہوا، اسی طرح اسے ہاتھ سے تھامے پیدل چلتا رہا۔ وہ موڑ بھی کاٹ لیا، جہاں سامنے نجے کے کمرے والی عمارت تھی۔

لیکن کریم کے پاؤں ٹک نہیں رہے تھے، عمارت کی بیرونی دیوار کے ساتھ سائیکل کو سہارا دیتا وہ رک گیا۔ شیریں والی بات اپنے منہ سے کیسے کہوں گا اگر اسے ناگوار لگا تو وہ پھر بلا پس و پیش گھر میں نہیں آیا کرے گا۔

کریم کو لگا —— شکر ہے، اس نے یہ بات اپنے منہ سے نہیں نکالی۔ خود پر حیرانی بھی ہوئی —— کہ وہ کس طرح لڑکی کی آبرو والی بات کہنے کے لیے آ گیا تھا یہ بھی خیال آیا —— اگر بات منہ سے نکل جاتی تو نجے کو بھی وہ عجیب مشکل میں ڈال دیتا۔ وہ شاید دوستی کا لحاظ کر کے ہاں کہہ دیتا لیکن بات اچھی نہ ہوتی...

اور کریم جلدی سے لوٹ کر ساتھ والی سڑک پر ہولیا اور اسی طرح اس کے منہ سے نکلا: ''یا خدا! کون سا وقت آ گیا ہے، میں اپنے ننجے کے گھر کے پاس سے چوروں کی طرح لوٹ رہا ہوں...''

کریم کو اگلے لمحے اپنی بیٹی پر غصہ آ گیا —— ''نصیبوں جلی —— تم نے یہ دل کو کون سا روگ لگا لیا ہے؟''

لیکن بیٹی کو نصیبوں جلی کہہ کر اس کا اپنا منہ گویا کڑوا ہو گیا تھا۔ پھر بیٹی پر ایک گونہ فخر بھی ہوا کہ اس کے دل نے کیسی گہرائیوں کو چھوا ہے۔

اسے کل شام والے شیریں کے وہ الفاظ یاد آئے —— ''تم پر گئی ہوں ابا!'' اور کریم کا دل اس کے لیے اُبل پڑا۔

کریم نے ایک پل کے لیے وجد میں آ کر شیریں اور ننجے کا چہرہ آنکھوں کے سامنے لا کر دیکھا لیکن اگلے لمحے اپنی سوچ کو لگام دے لی۔ آدمی کو اپنی اوقات نہیں بھولنی چاہیے... اس کی دوستی نصیب ہو گئی بڑی بات ہے۔ اب میں اس سے آگے کیا سوچ رہا ہوں...

کریم دھیمی رفتار سے سائیکل چلا کر شہر کی طرف چل دیا۔ ابھی کام کے اوقات میں کچھ وقفہ تھا لیکن گھر واپسی کا وقت نہیں تھا۔ پریس کے باہر والے بازار میں بیٹھ کر اس نے ایک پیالہ چائے اور پی اور پھر پریس چلا گیا۔

آج کریم کی زندگی کا پہلا دن تھا جب وہ اپنے کام پر توجہ مرکوز نہ کر سکا۔ رہ رہ کر دھیان بٹ جاتا۔ ایک بار یوں بھی ہوا —— ایک فرما مشین پر چڑھا کر اس نے دو ہزار کاغذ نکالنا تھا لیکن ایک ہزار چھاپ کر ہی فرما اتار دیا۔ صرف یہی غنیمت ہوئی کہ فرما کھول کر کسی نے ٹائپ کو ڈسٹری بیوٹ نہیں کر لیا کہ اتنے میں کریم کو غلطی کا احساس ہوا اور اس نے دوسری بار فرما مشین پر چڑھا لیا اور باقی ماندہ کاغذ چھاپ لیے۔

شام کو چھٹی کے بعد جب اس نے گھر جانے کے لیے سائیکل اٹھائی تو پاؤں کے آگے پھر چوراہا آ گیا... پاؤں اپنے آپ ننجے کے کمرے کی طرف مڑتے بھی تھے اور اس راستے سے اجتناب بھی چاہتے تھے۔

گھر پہنچا —— تو اس کے کانوں کو اعتبار نہ آیا۔ شیریں کے کمرے سے بہت دھیمی لے میں گانے کی آواز آ رہی تھی۔ کریم نے آگے بڑھ کر دروازے سے اندر جھانکا —— شیریں اس

کے دیے ہوئے قصوں کی اردو الفاظ میں نقل بنا رہی تھی اور ساتھ ساتھ قصے کے اشعار گنگنا رہی تھی۔

کھیڑیاں دی مہندی میلی، مَیالی بے رنگ
رانجھے دی پَکّی صادق گاڑھی سرخ

اگلا دن بھی بیت گیا۔ اس سے اگلا دن بھی۔ کریم نہیں آیا تو اس شام ننجے اس کی طرف چلا گیا۔ گلی مڑتے ہی فتے کا گھر تھا۔ ننجے نے دیکھا —— وہ ڈیوڑھی میں کھڑا اسے اشارے سے اندر بلا رہا ہے۔

ننجے ڈیوڑھی میں داخل ہوا تو فتے نے بیرونی دروازہ بند کر لیا —— ''تمہارا انتظار کر رہا تھا، کل بھی دو گھنٹے کھڑا رہا، کل تم آئے نہیں...''

''کیا بات ہے؟ کریم ٹھیک تو ہے۔'' ننجے نے فتے کی طرف دیکھا۔ ایک تشویش سی اس کے چہرے پر تحریر تھی۔

فتے نے آنگن میں بچھی چارپائی پر بیٹھتے اور ننجے کو بٹھاتے ہوئے کہا: ''ٹھیک ہے۔''

''لیکن گھبرایا ہوا ہے۔''

ننجے کو بہت استعجاب ہوا —— کوئی فکر والی بات تھی تو وہ پہلے میرے پاس آتا یا سلامت کے ہاتھ پیغام بھجواتا۔

میں نے اس سے کہا —— کہ جا کر تم سے بات کرے لیکن خاموش ہو گیا... فتے نے کہا تو ننجے نے تشویش سے پوچھا: ''لیکن بات کیا ہوئی ہے؟''

یہ اب میں بھی کیا کہوں... اسی لیے تو وہ خود تم سے ملنے نہیں گیا کہ وہ تم سے کیا کہے گا... کل سے منہ سر لپیٹ کر گھر میں پڑا ہے۔

ننجے نے اندازہ سا لگا لیا —— پوچھنے لگا: ''کوئی ہندو مسلمان کا سوال ہے؟''

''اور میاں! چھوٹے لوگوں کے سوال ہی کیا ہوتے ہیں... یہ غریبوں کو خدا کی مار ہوتی ہے بڑے بڑے امیروں کے گھروں میں تو لوگ مل جل کر کھاتے ہیں، مل کر بیٹھتے ہیں کوئی کسی کی طرف دیکھتا نہیں، کسی سے کچھ پوچھتا نہیں...

فتہ کہہ رہا تھا اور ننجے اسی لمحے چارپائی سے اٹھتا کہنے لگا: ''بس اتنی سی بات تھی وہ مجھ سے آ کر کہہ دیتا۔ کاموں کا کیا ہے، یہاں نہیں تو شہر میں کسی اور جگہ جا کر کر لیں گے۔ فتے نے بازو

سے تھام کر سنجے کر پھر بٹھا لیا کہنے لگا: ''صرف اتنی ہی بات نہیں، اپنی لڑکی ہے ناشیریں۔ محلے کے معتبر مل کر اس کا نکاح کرنے پر زور دے رہے ہیں اور اس نے صاف انکار کر دیا ہے۔

''لیکن تم تو کہہ رہے تھے —— ہندو مسلمان کا سوال ہے؟''

''اب بیچ کی بات کا تو پتہ نہیں چل رہا.. کل سے برکت اور نعمت بھی اس کے پیچھے پڑی ہوئی ہیں اور لڑکی روئے جا رہی ہے.. فتے نے کہا تو سنجے پھر چارپائی سے اٹھتا کہنے لگا'' میں خود جا کر کریم سے پوچھتا ہوں —— کیا بات ہے؟''

فتے نے اس کا بازو تھام لیا اور بولا: ''وہاں سب کے درمیان بیٹھ کر کیا پوچھو گے میں کریم کو یہاں بلا لاتا ہوں۔''

سنجے لمحے بھر کے لیے ٹھٹھک گیا۔ پھر کہنے لگا: ''اچھا، پچھلی طرف، مینار والی سمت، اسے بھیج دو، میں وہاں اس کا انتظار کرتا ہوں۔''

فتہ کریم کے گھر کی طرف چل دیا اور سنجے سائیکل لے کر مینار والے عقبی کھنڈروں کی طرف چلا گیا۔

کریم جب آیا۔ سنجے نے اس کا بازو تھام کر اس کے اترے ہوئے چہرے کو دیکھا اور کہا: ''پھر مشکل وقت میں تم نے اپنے یار کو کسی قابل نہیں سمجھا۔''

میں شرمندہ ہوں۔ مجھے خود ہی آنا چاہیے تھا...اور کریم نے ایک پتھر پر بیٹھتے ہوئے کہا: ''لیکن ساری بات ہی بہت الجھی ہے..توفیق ہو تو جی چاہتا ہے اس بستی سے نکل جاؤں۔''

سنجے ہنس پڑا: ''میاں! اگر سچ مچ سوچنے لگیں تو اس دنیا سے نکل جانے کو جی چاہتا ہے تم بتاؤ، کون سی جگہ ہے جہاں آدمی خود جیتا ہے اور دوسروں کو جینے دیتا ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے...'' کریم نے آہستہ سے کہا: ''ہر جگہ حرام کے تخم رہتے ہیں۔''

''یار! دنیا میں کئی بڑے بڑے ادیب ہیں۔ لوگوں نے ان کو جلاوطن کر دیا...خیر جو بھی ہوگا، دیکھا جائے گا تم بات تو بتاؤ۔''

بات تو وہی ہے جو نہ کبھی ختم ہوئی ہے، نہ ہوگی...جسے روتا روتا ہوا بلھے شاہ بھی چل بسا اور کریم کہنے لگا: ''جی چاہتا ہے میں بھی اسی کی طرح گلیوں میں اونچی آواز میں گاؤں ''دے میرے کل دے وچ'' کہہ رام داس کہہ فتح محمد، ایہو قدیمی شور...

سنجے نے کریم کے کندھے پر ہاتھ رکھا —— لیکن رام داس کی اور فتح محمد کی یاری کو اس شور سے کیا فرق پڑتا ہے... یہاں بستی میں نہ ملیں گے، بستی سے باہر مل لیں گے۔

نہیں...وہ تو فرق نہیں پڑتا...کریم کہتا کہتا چپ ہو گیا۔

اور دوسری بات کیا ہے؟ فتہ کچھ اور بھی کہتا تھا، سنجے نے پوچھا تو کریم نے سر جھکا لیا اور کہا: ''وہ بات بہت مشکل ہے۔''

سنجے ہنس دیا۔ ''اچھا اگر بہت مشکل ہے تو آؤ ہم سب جلاوطن ہو جائیں۔''

کریم نے بات کی تمہید باندھی: ''اپنی شیریں نے ایک ہی رٹ لگا رکھی ہے، مشین لگانی ہے اور محلے نے کنواری لڑکی کو جینے نہیں دینا۔''

سنجے کچھ دیر سوچتا رہا پھر کہنے لگا: ''کریم میاں! اگر تم اجازت دو تو میں شیریں سے کچھ دیر باتیں کر لوں؟''

''وہ تو اگر تم کہو تو ابھی بلوا لیتا ہوں، خود جا کر لے آتا ہوں، لیکن وہ تمھیں کچھ بتائے گی نہیں۔''

''نہیں...مجھے یقین ہے بتا دے گی...'' سنجے نے کہا تو کریم کہنے لگا: ''میں اسے جانتا ہوں وہ مجھ سے نہیں بولے گی۔''

سنجے نے کریم کا ہاتھ تھام کر اسے بٹھایا اور کہا —— اگر میرے منہ سے کوئی ایسی بات نکل گئی تو تمھیں پسند نہ ہوئی تو مجھ سے وعدہ کرو کہ غضب نہیں کرو گے۔''

کریم نے کہا کچھ نہیں، صرف وعدہ کرنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

کریم چلا گیا تو سنجے نے کھنڈروں کی ایک دیوار پر ہاتھ رکھ کر یوں آنکھیں موند لیں —— جیسے ان کھنڈروں کے آباد لمحوں کی کوئی آواز سن رہا ہو۔

دیوار پتھروں کی تھی..ٹوٹتی پھوٹتی صدیوں سے کھڑی ہوئی، سنجے نے اسے آہستہ آہستہ ہتھیلی سے چھوا۔ اس کے فرسودہ ریزے ہتھیلی سے لگ گئے تو سنجے نے وہ ہتھیلی اپنی پیشانی سے چھو لی۔

پیشانی ایک گونہ احترام سے خم ہوئی۔ جیسے عمر رسیدہ مٹی کو پرنام کر رہا ہو۔

کریم جس وقت شیریں کو ساتھ لے کر آیا —— اندھیرا کچھ اور گہرا ہو گیا تھا۔ شیریں نے دور سے سنجے کو نہیں دیکھا۔ وہ بہت قریب آ گئی تھی جس وقت اس نے دیکھا —— تو اس کے سارے بدن پر ایک ہلکی سی کپکپی طاری ہو گئی۔

پھر شیریں نے ایک شکوے کے سے انداز میں باپ کی طرف دیکھا۔ جس نے راستے میں اسے کچھ نہیں بتایا تھا اور قرب وجوار کی تنہائی کو دیکھتے ہوئے اسے ایک نئی تشویش نے گھیر لیا—— ابا تم نے کہا تھا یہاں خطرہ...

شیریں نے نجے کی طرف ہاتھ بڑھا کر یہ بات کہی تو نجے سمجھ گیا۔ پوچھنے لگا: ''کسے، مجھے؟''

لیکن اب تو ہم ایک ساتھ ہیں، میں جو یہاں کھڑا ہوں...کریم نے کہا اور ذرا دور ہٹنے لگا۔

تم یہیں بیٹھو یار! جانے کی ضرورت نہیں، جو پوچھنا ہے وہ تمہارے سامنے پوچھوں گا، نجے نے کہا تو کریم ذرا ہٹ کر ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ شیریں کو بھی ایک چوڑے پتھر پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے نجے نے کہا: ''تو یہاں اکیلے انسان کو خطرہ ہوتا ہے...''

شیریں کو لگا—— کہ نجے نے بات سمجھی نہیں، کہنے لگی: ''اس طرح نہیں لیکن مذہب کی بنا پر...''

تو اکیلے مذہب کو خطرہ ہوتا ہے... نجے ہنسنے لگا۔ تو ذرا فاصلے پر بیٹھے کریم کی ہنسی نکل گئی۔ نجے کہہ رہا تھا: ''پھر تو جیسے دو آدمی مل کر چلتے ہیں۔ خطرے سے بچنے کے لیے، دو مذہب بھی مل کر چلنے چاہئیں، خطرے سے بچنے کے لیے۔''

شیریں نے نظر اٹھا کر نجے کی طرف دیکھا—— آنکھیں ایک عجیب پرستش سے بھر آئیں۔

نجے شیریں کے سامنے والی اونچے نیچے پتھروں پر بیٹھتا کہنے لگا: ''پھر کچے الفاظ کو سچ مچ پکانا ہے؟''

''ہاں۔'' شیریں نے کہا۔

''لیکن میں پریس کی بات نہیں کر رہا...''

شیریں نے پھر نگاہ بھر کر سامنے دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو، پھر اور کون سی بات؟

زندگی میں اور بھی لفظ ہوتے ہیں، بہت کچے، وہ بھی کسی آگ میں پکانے ہوتے ہیں۔ نجے نے یہ کہتے ہوئے شیریں کی طرف دیکھا اور کہا—— ''محبت، شادی، رشتہ... یہ سب چیزیں بھی ہوتی ہیں، کچے الفاظ کو پکانے کے لیے۔''

شیریں نے سر جھکا لیا، شاید آنکھیں بھر آئی تھیں، دھیمے لہجے میں کہنے لگی: ''...شاید... مگر کئی

لوگوں کے الفاظ ہمیشہ کچے رہتے ہیں۔''

شیریں کی آواز نجے کے پاؤں کی رگوں تک اتر گئی۔

نجے نے ہاتھ بڑھا کر شیریں کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور کہا: ''میں تمھیں قبول نہیں؟''

شیریں نے سر جھکا لیا۔ اتنا کہ اس کا ماتھا نجے کے ہاتھ سے چھو رہا تھا لیکن وہ بولی تمھیں نہیں قبول؟ نجے جب ہاتھ کو آہستہ سے پیچھے ہٹانے لگا تو شیریں نے کانپتی انگلیوں سے ہاتھ کو تھام لیا۔ اوپر دیکھا، نظر بھر کر اور کہنے لگی: ''کچھ الفاظ گونگے بھی ہوتے ہیں۔''

نجے نے شیریں کے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے چھوا اور پھر ذرا اونچی آواز میں بولا: ''کریم میاں! تمہاری اس گونگی بیٹی کو پھر سلام کرتا ہوں۔''

نجے اپنے ہاتھ کو واپس لیتا اٹھنے لگا، شیریں نے پھر ایک بار ہاتھ تھام لیا اس کی طرف دیکھا، پوچھا، بیتے ہوئے کل کے پیالے میں سچ مچ آنے والے کل کا پانی پیا جا سکتا ہے؟

شیریں ابھی اسی طرح پتھر پر بیٹھی ہوئی تھی، نجے نے اٹھ کر شیریں کے پاس آ کر اسے آہستہ سے اپنے پہلو سے لگا لیا اور دیکھا—— کریم ابھی بھی فاصلے پر تھا اس نے جھک کر شیریں کے ہونٹ چوم لیے اور آہستہ سے کہا: ''مجھے معلوم تھا—— تم ہی ماضی کے پیالے میں مجھے مستقبل کا پانی پلاؤ گی۔''

کریم میاں! نجے نے پھر آواز دی، کریم پاس آیا تو نجے نے کہا، تم کہتے تھے نا، ادیب پیغمبر ہوتے ہیں۔ سچ ہو جاتا ہے۔ دیکھ، ناول کا آخری حصہ سچ ہو گیا۔

کریم نے ہتھیلی سے اپنے آنسو پونچھے اور کہنے لگا: ''میں نے سوچا تھا—— ننھی تاجی میں شاید ممتاز کی روح ہے لیکن اس کی روح تو میری شیریں میں ہے۔

ابا! شیریں اٹھ کر باپ کے گلے لگ گئی۔ ''میں تمھیں کہتی تھی نا—— میں تم پر گئی ہوں... اور نجے کی طرف دیکھتی پوچھنے لگی: ''ناول کا آخری حصہ کون سا؟''

دوبارہ جنم والا، جب میرے کردار کو دوبارہ گوشت پوست کا وجود مل جاتا ہے۔

''انچاسویں دن'' نجے نے کہا تو شیریں کو یاد آ گیا وہ حیات بعد الموت والا؟ نجے نے شیریں سے نہیں کریم سے کہا، اس زمین پر جنت بھی ہوتی ہے، دوزخ بھی۔ یہیں انسان کئی بار مرتا اور پھر جنم لیتا ہے...آج تمہاری شیریں نے مجھے نیا وجود دیا ہے—— دوبارہ اس زمین پر جینے کے لیے۔

کریم نے بنجے کو گلے سے لگالیا۔ شروع سے کہا کرتا تھا —— تم میرے یار بھی ہو... بیٹے بھی... لیکن یہ بات تو میرے خواب سے بھی ماورا تھی...

اور کریم نے پھر آنکھوں میں اُمڈی نمی کو ہتھیلی سے پونچھا اور کہا: ''آج تم نے شیریں کو جس نئے وجود کا نام دیا ہے —— اس کا یہی نام رکھ لو کایا —— اور اسے ہندو بنا کر...

بنجے نے کریم کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا: ''نہیں میاں! مذہب بدلنے والی بات نہ میں کروں گا نہ شیریں... ابھی کہا تھا نا جیسے دو آدمی مل کر چلتے ہیں، خطرے سے محفوظ رہنے کے لیے، اسی طرح مذہبوں کو بھی مل کر چلنا چاہیے، خطرے سے بچنے کے لیے۔''

یہ ممکن ہے؟ شیریں نے پوچھا تو بنجے ہنس دیا: ''ہاں ہمارے دوزخ کا یہ قانون بہت عمدہ ہے۔''

شیریں بائیں جانب تھی، بنجے دوسری طرف —— کھنڈروں کی طرف سے بستی کی طرف مڑتے ہوئے کریم کو لگا —— آج اس کی آغوش بھری ہوئی ہے۔

بستی والے؟ ایک بار کہا تو بنجے ہنس دیا، وہ انچوسویں دن کی سوغات بھی تو بددعا ہے... دھرتی پر دوبارہ جنم لینے کا مطلب یہی تو ہوتا ہے۔

نئے سرے سے جدوجہد۔

ابھی تو تاج پریس کھولنا ہے... ابھی تو شاید ناول کو بھی ضبط ہونا ہے... لیکن یہ تو روزانہ کے سورج کے لیے بادلوں جیسی بات ہے۔

+ +

بلراج ورما کے دیگر تراجم اور مطبوعات

ترجمے:

- درد کے رشتے (1983) میرجی انارائے کے مشہور کناڑا ناول ''نسرگ'' (ہندی سے) کا اردو ترجمہ، نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا
- ہندی کے یک بابی ڈرامے (مرتبہ نمی چندر جین، 1986) کے اردو تراجم کا مجموعہ، نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا
- لوک راج (1990) بیرندر کمار بھٹاچاریہ کے مشہور آسمیہ ناول ''یار و انگم'' کا اردو ترجمہ، ساہتیہ اکادمی، دہلی
- عبدالحق (1991) مختارالدین احمد کے اردو مونوگراف کا انگریزی ترجمہ، ساہتیہ اکادمی، دہلی

تخلیق (اُردو فکشن)

- الیوژن (افسانے) تناظر پبلی کیشنز، دہلی
- کابوس (افسانے) " " "
- آگ، راکھ اور کندن (افسانے) " " "
- شب تار (چار ناولٹ) ترالی دنیا پبلی کیشنز، دہلی
- تمثیل (چار ناٹکیہ خاکے) کتابی دنیا، دہلی
- گوتم (اردو ناول) اردو مرکز، عظیم آباد

تخلیق (ہندی فکشن):

- سنکلپ
- سدھارتھ
- سرگم

صحافت:

- تناظر (اردو جریدہ) 1977 سے جاری
- سنگیت ناٹک (سنگیت ناٹک اکادمی کا انگریزی سہ ماہی) 1981-1983
- حالِ ہند (اُردو ماہنامہ) 1986-1988
- دی رائزنگ نیشن (انگریزی ماہنامہ) 1986-1988